جامۂ حرف

دیکھو کہ ہم حریفِ احساس بن کے جی رہے
آتش کدے میں شاخِ کنول بن کے جی رہے

وہ زلزلہ کہ زیر و زبر ہو گیا جہاں
کچھ لوگ پھر بھی تاج محل بن کے جی رہے

چنگیز لوٹتے رہے حسنِ عروسِ فن
ہم پاسبانِ نازِ غزل بن کے جی رہے

تقی انجم
28/11/76

تقی انجم علیگ

تحفہ
جناب مرتضیٰ
صاحب

[illegible] کی خدمت میں

محمد حیات سیال
18/3/76

M. Hayat Khan Sial
Assistant Professor,
Govt: College, JHANG.

جامۂ حرف

تقی انجم علیگ

زیرِ اہتمام

قرطاس

ادیبوں کا اشاعتی ادارہ

۴۸۰ - ڈی ، پیپلز کالونی ، فیصل آباد

جامۂ حرف

تقی انجم علیگ

MASOOD FAISAL JHANDIR LIBRARY
Acc No. 035386
MAILSI

سلسلۂ اشاعت

۱۵

TECHNICAL SUPPORT BY
CHUGHTAI
PUBLIC LIBRARY

جملہ حقوق بحق مصنّف محفوظ

• کتابت : احسان الحق • بار اوّل : یکم دسمبر ۱۹۷۸ء
• قیمت : ۱۵ روپے • مطبع : لائلپور نفیس پرنٹنگ پریس فیصل آباد

قرطاس

انتساب

مجید امجد مرحوم

اور

جعفر طاہر مرحوم

کے نام

انتخاب و ترتیب

محمد حیات خاں سیال

ترتیب

نظمیں

اختتامیہ

تعارف

انجم صاحب کے بارے میں یہ تو معلوم تھا کہ وہ ایک خوش فکر شاعر اور نقاد ہیں اور قدرت نے انہیں نکھرا ہوا ذوقِ نظر بھی عطا کیا ہے مگر یہ معلوم نہ تھا کہ وہ ایسے اچھے انسان بھی ہیں۔ بے شک ان کی دلکش شخصیت سے ان کے ملنے والے متاثر ہیں اور ان کی تعریف میں رطب اللسان بھی رہتے ہیں مگر میں نے اس تعریف کو سدا شک وشبہ کی نظروں سے دیکھا کیونکہ فی زمانہ تعریف اور مقصد براری ایک دوسری سے بُری طرح منسلک ہیں اور منافقت کی پھیلی ہوئی گرد میں اصل صورتِ حال نظروں سے اوجھل ہی رہتی ہے مگر جب محترم محمّد حیات سیال نے مجھے انجم صاحب کا کلام بھجوایا اور میں نے اسے پڑھا تو معاً صحیح معنوں میں انجم صاحب سے ملاقات ہوئی اور ان کی ایک ایسی شخصیت چشمِ تصوّر کے سامنے اُبھر آئی جس میں بلا کی دلکشی اور سندرتا تھی۔ مجھے ہمیشہ یہ محسوس ہوا ہے کہ نثر کھدّر کا لباس ہے جو جسم کو پوری طرح چھپا لیتا ہے لیکن شاعری ململ کی طرح ہے جو جسم کو ڈھانپتی تو ہے مگر چھپاتی نہیں۔ اسی لئے اگر کسی شخص کے اصل روپ سے آشنا ہونا ہو تو اس کا کلام پڑھو کیونکہ کلام میں وہ ایک بڑی حد تک عریاں نظر آئے گا۔ میں نے انجم صاحب کا کلام پڑھا تو اس میں مجھے ایک ایسا انسان دکھائی دیا جو مدتوں اپنی ہی ذات کی اُس "جائے پناہ" کا باسی بنا رہا جس کے در و دیوار سے خوشبو کی نہریں بہتیں جو راگ اور روپ کا مندر تھا، جس میں ساگر کی سی کشادگی اور بیکرانی تھی اور جسے انجم صاحب نے اپنی نظم "دستک" میں "دل کا گھر" کہا ہے۔ مگر پھر اس گھر کے دروازے پر دستک ہوئی اور انجم صاحب نے کہانی کے معصوم انسان کی طرح پرانے چراغ کے عوض ایک نیا چراغ حاصل کر لیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ ہنستا بستا گھر، خوشیوں سے معمور گھر منافقتوں کی زد میں آگیا، گھر کے ستون برف میں تبدیل ہو کر گرمئ وفا سے محروم ہوئے اور ہر طرف بھوتوں کے جے کارے گونجنے لگے، دیواروں کا رنگ اڑا اور تاریکی

نے ڈیرے ڈال لئے اور گھر کے مکین پر اس بات کا انکشاف ہوا کہ وہ تو بھری دنیا میں اکیلا رہ گیا ہے۔ جی نہیں جانتا کہ انجم صاحب کی زندگی میں یہ واقعہ کس نوعیت کا تھا جس نے انہیں اس قدر دُکھی اور اکیلا کر دیا مگر اس قدر میں ضرور جانتا ہوں کہ تنہائی کے اس کرب ہی سے انجم صاحب کو عرفان حاصل ہوا اور پھر انہیں دبیز نقابوں کے پیچھے مکروہ مسکراہٹوں میں بسے ہوئے خدّوخال صاف دکھائی دینے لگے۔ زندگی کے کارواں کی رفتار کا احساس ہوا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ وقت کس قدر ظالم ہے۔ اس گہرے کرب کی آتشِ سوزاں ہی سے انجم صاحب کی شعری شخصیت کندن بن کر نکلی یعنی معصومیت اور سادہ دلی کی صفات سے دستکش ہوئے بغیر انہیں یہ صلاحیت عطا ہوئی کہ وہ زندگی کے اصل چہرے کو دیکھ سکیں۔!

وزیر آغا

۲۶ر نومبر ۱۹۷۶ء

نعتیں

لیلۃ القدر کا جلوہ تم ہو
مطلع الفجر کے معنیٰ تم ہو

میں کہ بیمارِ غمِ دنیا ہوں
غمِ دنیا کا مداوا تم ہو

آج کِس سمت قدم اٹھتے ہیں
یہ مجھے کِس نے بلایا تم ہو؟

میں تہی دست تہی دامن ہوں
لطف و بخشش کا خزانہ تم ہو

ہے سیہ نامۂ اعمال مرا
مرے اعمال کا پردہ تم ہو

دل کہ محرومِ نوائے غم ہے
دل بیمار کے عیسیٰ تم ہو

کُلِّ سیّات کا مرجع میں ہوں
کلِّ حسنات کے ماویٰ تم ہو

اور کیا چاہیئے اُس کو جس کے
مرجعِ چشمِ تمنا تم ہو

روسیہ و دل مردہ میں ہوں
حُسنِ یوسف، دمِ عیسیٰ تم ہو

کیا یہ ممکن ہے کہ انجمؔ جیسے
شخص کے حامی و مولا تم ہو

متاعِ درد ملی ہے تری نظر کے طفیل
ترا غلام بنا شاہ تیرے گھر کے طفیل

خُدا گواہ کہ تُو رحمتِ دو عالم ہے
خدا گواہ یہ سب کچھ ہے تیرے در کے طفیل

تڑپ کے نام لیا تیرا بھر گیا دامن
کرم کی حد نہ رہی عرضِ مختصر کے طفیل

وہ جس کو پالا تھا آغوشِ تربیت نے تری
خدا کا دین ہے قائم اسی کے سر کے طفیل

مَیں پاشکستہ پڑا ہوں مجھے سہارا دے
جنابِ فاطمہؑ کے گوشۂ جگر کے طفیل

مَیں تشنہ لب بھی ہُوں بازو بریدہ بھی ہوں مجھے
سہارا دیجئے عبّاسِ نامور کے طفیل

مرے قدم نہ رُکے کوہ دشت و دریا میں
یہ معجزہ تھا فقط ذاتِ راہبر کے طفیل

یا ایّہا المدثرُ ہم سر برہنگاں
جائیں تلاشِ سایۂ رحمت میں اب کہاں؟

یا ایّہا المزّمّل یہ اطلس و حریر
انسانیت کی کیسی اڑاتے ہیں دھجیاں

ہم وارثِ روایت بدر و حنین ہیں
ہم دَیر کے خرابہ میں ہیں گنجِ شائگاں

تنکوں کی چھاؤں ڈھونڈنے نکلے ہیں آجکل
جو زد پہ بجلیوں کی بناتے تھے آشیاں

کیوں مصلحت کے صیدِ زبوں ہو گئے ہیں لوگ
اعلائے حق کے سامنے کیا سُود کیا زیاں؟

کِس نے جلا دیا یہ چمن کچھ تو بولیئے
بیٹھے ہیں لوگ ڈالے ہوئے منہ میں گھنگیاں

تولو تو شمر و ابنِ زیاد و یزید سے
میزان میں ہے سایۂ غدّار بھی گراں

غزلیں

کتنے رفیق گردِ سفر بن کے اُڑ گئے
ہم راستوں کی وسعتِ ویراں میں کھو گئے
میرے چمن ملے تری خوشبو کو عمرِ خضر
ہم جستجوئے چشمۂ حیواں میں کھو گئے

○

مری وفا بھی فسانہ تری جفا بھی فسوں
یہاں ہر ایک کی مجبوریاں ہیں گوناگوں

یہ احترامِ تمنا یہ احتیاطِ جنوں
کہ تیری بات کروں اور تیرا نام نہ لوں

مری تلاش میں شاید ہے وہ بھی سرگرداں
مزاجِ موجِ ہوا اس قدر لطیف ہے کیوں

ہزار بار لباسِ گُل و سمن میں مِلا
مَیں بے وفا تجھے سمجھوں تو کِس طرح سمجھوں

ابھی کچھ اور دھڑکتی رہے گی نبضِ وفا
ابھی وہ اور سنواریں گے گیسوئے شبگوں

نہ کوئی پاؤں کی آہٹ نہ شعلۂ آواز
یہ سنسناتی ہوئی رات کِس طرح کاٹوں

تو وہ گھٹا کہ برستی ہے کھل کے دریا پر
مَیں ایک دشت کہ اپنی تپش میں آپ جلوں

ہر تیشۂ غم کو سہہ گیا ہُوں
دیوار کی طرح چُپ کھڑا ہُوں

پتھر تو پگھل کے بہ گئے ہیں
مَیں موم سے سنگ ہو گیا ہُوں

تنہائی اور اتنی سخت تنہائی
دیواروں سے بات کر رہا ہُوں

تدبیر کی بے بسی تو دیکھو
زنجیر سے کھیلتا رہا ہُوں

تم مجھ کو کیا سمجھ سکو گے
میں خود ہی کب سمجھ سکا ہُوں

کیا پوچھتا ہے حسابِ ہستی
یہ پوچھ کہ کس طرح جیا ہُوں

اس دوزخِ روز و شب میں انجمؔ
مَیں نصف صدی سے جی رہا ہُوں

سایۂ شہپرِ جبریلِ امیں رکھتے ہیں
ہم تو اللہ کی رحمت پہ یقیں رکھتے ہیں

سانس روکے ہوئے تکتے ہیں ستارے ان کو
عزم کچھ اور ہی یہ اہلِ زمیں رکھتے ہیں

قدسیوں سے بھی نکلتا ہوا رہتا ہے یہ سر
جب کبھی ہم ترے قدموں پہ جبیں رکھتے ہیں

سرحدِ کون و مکاں زد میں ہے دیوانوں کے
پاؤں پڑتے ہیں کہیں اور کہیں رکھتے ہیں

ماورائے مہ و پروین بھی ہے اپنا رشتہ
ہم فقط خاک سے پیوند نہیں رکھتے ہیں

بات کہتے ہیں بُرا مان نہ جانا انجم
بخدا تم پہ ہم الزام نہیں رکھتے ہیں

○

طے کیجے غم کی منزلیں جیسے بھی بن پڑے
شاید کہیں تو وادیٔ سرو وسمن پڑے

یہ قربتیں کہ خود پہ تمہارا گمان ہو
یہ فاصلے کہ تم کو پکارے نہ بن پڑے

کچھ درد اپنے حُسنِ تکلّم میں چھپ گئے
کچھ زخم ان کے شوخ تبسّم سے چھن پڑے

اپنا ہی عکس ذوق جنوں تھا ترا جمال
ایسے ہزار عکس چمن در چمن پڑے

ہم ہیں کہ ایک خارِ الم ڈھونڈتے رہے
رستے میں کتنے سرو گُل و یاسمن پڑے

کچھ درد زندگی کے تقاضوں میں کھو گئے
کچھ رہ گئے کہ جن پہ حجابِ سخن پڑے

انجم کچھ احتیاط بھی لازم ہے شوق میں
ایسا نہ ہو کہ ان کی جبیں پر شکن پڑے

سر میں دیوانوں کے وحشت کا اثر باقی ہے
دیکھ صحرا میں نہ دیوار نہ در باقی ہے

اب بھی اُس آبلہ پائی کا اثر باقی ہے
اِک چراغاں سا سرِ راہ گزر باقی ہے

کوئی دیوانگیٔ اہلِ جنوں تو دیکھے
پا شکستہ ہیں مگر عزمِ سفر باقی ہے

جھلملاتے ہیں ستارے سرِ مژگاں اب بھی
پرسشِ دوست بہ اندازِ دگر باقی ہے

منزلیں پاؤں تلے آپ سمٹ آئی ہیں
ابھی چہروں پہ مگر گردِ سفر باقی ہے

اب بھی چاہیں تو بیاباں کو گلستاں کر دیں
کم سے کم اتنا تو اعجازِ نظر باقی ہے

گھوم پھر کر ترے قدموں میں چلے آئیں گے
اِک ذرا مرحلۂ شمس و قمر باقی ہے

اُف یہ زنجیرِ گرانبار کہ کاٹے نہ کٹے
ہائے یہ رات کہ تا حدِ سحر باقی ہے

جو میرے پاس سے بیگانہ بن کے گزرا تھا
وہ شخص مجھ سے زیادہ مرا شناسا تھا

نہ کوئی پاؤں کی آہٹ نہ سانس کی خوشبو
ہمارا درد ہی صورت بدل کے آیا تھا

ہر ایک آئینۂ رُخ پہ گرد چھائی ہے
ہر آئینے میں کبھی اپنا عکس پڑتا تھا

پھر ایک آس کا تیزاب کیوں چھڑکتے ہو؟
ابھی تو درد کی لذت سے مسکرایا تھا

تمہاری زلف کے سایہ میں سانس تو لیتے
تمہاری زلف کا سایہ تو آپ جلتا تھا

وہ اِک حصار جو کھینچا تھا مجھ سے چھپنے کو
اِسی حصار سے خود تم نے ہم کو جھانکا تھا

چھوؤ تو برف کا تودہ، بچو تو شعلۂ برق
تمہارے قرب نے جادو عجب جگایا تھا!

اے دوست دل سے شوق ترا کم نہ ہو سکا
جو چاہتے تھے آپ وہ عالم نہ ہو سکا

ہر سمت شورِ دار و رسن گونجتا رہا
شعلۂ حیات کا کبھی مدھّم نہ ہو سکا

بہلا رہا ہوں دِل کو غمِ روزگار سے
لیکن اگر یہ درد بھی مرہم نہ ہو سکا؟

سجدہ کیا ہے کس نے تمہیں کچھ تو سوچئے
وہ سر جو کٹ گیا ہے مگر خم نہ ہو سکا

ہر زخم کو شریکِ تبسّم بنا لیا
انجم اسیرِ شیوۂ شبنم نہ ہو سکا

کس نے کھولے ہیں عنبریں گیسو؟
چاندنی میں ہے اِک عجب خوشبو

ہائے یہ تیرگی و تنہائی
ان کا غم بھی بچا گیا پہلو

یوں تری یاد جاگ اٹھتی ہے
جیسے ساون کی رات میں جگنو

غم کے بہروپ کوئی کیا جانے
شاعری، راگ، قہقہے، آنسو

کتنی یادوں کے قافلے گزرے
اور ہم دیکھتے رہے ہر سُو

آج پھر کوئی درد جاگا ہے
آج پھر خشک ہو گئے آنسو

دُور تک احساس کا تپتا ہُوا صحرا مِلا
ایک اِک آنسو کا قطرہ آگ کا دریا مِلا

میرا دامن دیکھئے میرا گریباں دیکھئے
کیا بتاؤں راستہ میں جو مِلا اپنا مِلا

بزم میں ان کی ہمیں عرضِ ہُنر تک منع تھا
اور ایسے لوگ بھی تھے جن کو جو چاہا مِلا

آج کی پُروا میں کتنے زخم تازہ ہو گئے
آج کی برکھا میں اِک اِک پھُول مُرجھایا مِلا

دُور سے دیکھو تو کتنے جانے پہچانے ہیں لوگ
پاس سے دیکھا تو سارا شہر بیگانہ مِلا

ہر دریچہ بند تھا اور ہر گلی ویران تھی
آج تو —— شہرِ وفا میں ایک سنّاٹا مِلا

سحرِ قاتل سے لبِ اعجاز ساکت ہو گئے
زہر میں ڈوبا ہوا تریاق کا پیالا مِلا

خوشبوؤں کے شہر میں سڑتی ہوئی لاشوں کی بُو
راگنی کے دیس میں اِک شورِ واویلا مِلا

حسرتیں ڈوبنے والوں کی جواں ہیں ساقی
ابھی ساحل پہ سفینوں کے نشاں ہیں باقی

معجزے وہ مے و مینا کے کہاں ہیں ساقی
مری آنکھوں سے ابھی اشک رواں ہیں باقی

ترے الطاف تو برحق ہیں مگر اپنے نصیب
دِل پہ ابھی گردشِ دوراں کے نشاں ہیں باقی

تو نے کیا چشمِ عنایت سے مجھے دیکھ لیا
مہر و مہ بھی مری جانب نگراں ہیں ساقی

ہم فقیروں کو نہ ٹھکرا کہ ہمارے دم سے
میکدہ، دیر و حرم کون و مکاں ہیں ساقی

جذب کر لے مے و مینا کی فضاؤں میں کہ ہم
حرم و دیر پہ اک بارِ گراں ہیں ساقی

قصۂ دار و رسن سُن کے ابھی آیا ہوں
ذرا لانا تو وہ سامان کہاں ہیں ساقی

وقت کے ہاتھوں نے پیمانوں میں سم گھول دیا
حوصلے پھر بھی تو رندوں کے جواں ہیں ساقی

رندوں کا بیاں اور ہے واعظ کی زباں اور
ایمان و یقیں اور ہے الفاظ و بیاں اور

بُت خانہ کی بات اور ہے جنّت کا بیاں اور
دیکھی ہوئی شے اور حدیثِ دگراں اور

ہم رند کہ پیتے ہیں تو پیتے ہی رہیں گے
یہ حضرتِ واعظ ہیں یہاں اور وہاں اور

ساقی یہ ترا لطفِ مسلسل تو بجا ہے
لیکن تری باتوں پہ گزرتا ہے گماں اور

ہم تیشۂ ہمّت کو علم کرکے چلیں گے
ہم جانتے ہیں راہ میں ہیں سنگِ گراں اور

پھوٹے گا سیہ خانوں کی ظلمت سے اُجالا
اُبھریں گے ہر اک ذرّہ سے خورشیدِ جواں اور

ہم نے کیا کھویا کیا پایا کہنے کی یہ بات نہیں ہے
جیت کہیں تو جیت نہیں ہے مات کہیں تو مات نہیں ہے

اہلِ چمن کے تیور دیکھو جیسے کوئی بات نہیں ہے
اور چمن کا نقشہ یہ ہے پھول نہیں ہے پات نہیں ہے

اِک اِک کر کے کلی کلی کا منکا ڈھلکا جاتا ہے
اوس سے کب تک پیاس بجھے گی کو سوں تک برسات نہیں ہے

کب تک دھوکا کھائے جاتے جاگ اُٹھے ہیں نیند کے ماتے
دن کو جوت چرانے والو دن ہے آخر رات نہیں ہے

میرا اِس میں دوش نہیں ہے وقت ہی ایسا آن پڑا ہے
ورنہ تجھ کو یاد نہ کرنا اپنے بس کی بات نہیں ہے

دیپک کی اِک تان اڑا کر خود ہی آگ لگا دی ہم نے
اپنی بربادی میں انجم اور کسی کا ھاتھ نہیں ہے

خوشبو کا دیس، حُسن کا منظر، خوشی کا شہر
پوچھو نہ دل کی بات یہ دل تھا کسی کا شہر

اِک اِک چراغ دِل کے دریچوں میں بُجھ گیا
تاریکیوں میں ڈوب گیا روشنی کا شہر

آئینہ بندئ در و دیوار دیکھئے
اچھا جواب ہے مِری دیوانگی کا شہر

یہ برف کے ستون یہ پتھّر کی مُورتیں
آئینہ بن گیا ہے تری بے رُخی کا شہر

مَیں پا شکستہ اور یہ طوفانِ رنگ و بُو
خاکہ اُڑا رہا ہے مری بے کسی کا شہر

آئی نہ پھر سے لَوٹ کے دیوانگی کی رُت
بستا گیا ہر ایک طرف آگہی کا شہر

صحرائے دل میں پھر تری آوازِ پا کے بعد
آباد ہو کے رہ گیا اک خامشی کا شہر

صحرا کی دھوپ شہر کی چھاؤں سب ایک ہیں
انجمؔ کبھی ہوا ہے کسی اجنبی کا شہر

کون یہ آنکلا یارب دل کی سُونی محفل میں
آگ سی اک لگ جاتی ہے باتوں سے جس کی دل میں

بھولے بھٹکے راہی کو بستی تو مِل جاتی ہے
لیکن فرق بہت کچھ ہے بستی میں اور منزل میں

طوفاں میں ہنس کر مرنا ساحل پر رو کر جینا
اور تو کوئی فرق نہیں طوفاں میں اور ساحل میں

یوں تو زباں سے ہم ہر دَم آپ ہی کے گن گاتے ہیں
لیکن یہ دُنیا والے جھانک بھی لیتے ہیں دِل میں

ہم کو تمہاری باتوں پر اب بھی یقین آجاتا ہے
گو کہ تجربے کہتے ہیں کون کسی کا مشکل میں

طوفاں ہی شاید ہم کو منزل تک پہنچا دیتے
اب تو کہیں کے بھی نہ رہے آکے فریبِ ساحل میں

○

حُسن ہے خالقِ نگاہ و خبر
حُسن دیوانہ گر نہیں ہوتا

ہر غمِ معتبر کو پرکھا ہے
کوئی غم معتبر نہیں ہوتا

عشق اُفتادگی کا نام نہیں
عشق بے بال و پَر نہیں ہوتا

آشیانے قفس بھی بنتے ہیں
ذوقِ پرواز اگر نہیں ہوتا

منزلیں ہر قدم پہ ملتی ہیں
راہ رو باخبر نہیں ہوتا

بوذری کی ہو جس میں کچھ بُو باس
وہ گرفتارِ زر نہیں ہوتا

جو قفس کو اُڑا کے لے جائے
وہ تو بے بال و پَر نہیں ہوتا

آج اک لمحۂ مسرّت میں
کتنے دکھ کتنے درد یاد آئے

فکرِ تسکینِ غم نہ فرماؤ
غم سے بچ کر کوئی کہاں جائے

تم سے دُوری کے قیمتی لمحات
بعد مدّت کے لوٹ کر آئے

ہم نے بھی کون سی وفا کی تھی
آپ ناحق جفا پہ پچھتائے

کوئی غم بھی نہیں خوشی بھی نہیں
جانے کیوں آج اشک بھر آئے

کتنی یادوں کے قافلے گزرے
ہم جہاں تھے وہیں سے لوٹ آئے

دل بھی کم بخت کیا قیامت ہے
غم بہ اندازِ لطف یاد آئے

تم بڑے زُود رنج ہو انجم
کِس طرح کوئی تم کو سمجھائے؟

پھول اِک اِک کر کے کملاتے رہے
ہم بہاروں ہی کے گن گاتے رہے

تیرگیٔ شامِ غم بڑھتی رہی
چاند تارے نُور برساتے رہے

منزلیں اب تک ہیں گرمِ انتظار
قافلے آتے رہے جاتے رہے

وہ طلسمِ خواب ہائے آرزُو
آنکھ کُھلنے پر بھی یاد آتے رہے

اُن کی بے مہری کو کہہ کر مصلحت
ہم بھی اپنے جی کو بہلاتے رہے

شکوۂ بے مہریٔ ایّام تھا
آپ ناحق جی میں شرماتے رہے

اُن کے ہر عُذرِ شکستِ عہد پر
ہم فریبِ آرزُو کھاتے رہے

ہائے انجمؔ کس قدر نایاب لوگ
زندگی بھر ٹھوکریں کھاتے رہے

○

پھر بھی شکر بجا لاتا ہوں دل پہ کرم فرمانے کا
حال بدلنا سہل نہیں ہے صدیوں کے ویرانے کا

بڑھ کے گریباں سے رگِ جاں پر ہاتھ پڑا دیوانے کا
اپنی دُھن میں ہے رہنے دو یہ وقت نہیں سمجھانے کا

ہم نے دل کی آگ میں جل کر پھول کھلانا سیکھا ہے
پھول چرائیں ہم سے دامن ہائے رنگ زمانے کا

آج بھی گِھر گِھر بادل آئے آج بھی کھل کر مینہ برسا
آج بھی موقع ہاتھ نہ آیا دل کی آگ بجھانے کا

ہم وفا کر نہ سکے اُن سے جفا ہو نہ سکی
ایک بھی رسمِ محبت کی ادا ہو نہ سکی

بھُول کر لب پہ ترا نام نہ آیا لیکن
بھُول کر آنکھ بھی ہم رنگِ حنا ہو نہ سکی

دِل میں ٹوٹے ہُوئے ہر نشترِ غم کو پرکھا
اِک خلش بھی تو رگِ جاں سے جُدا ہو نہ سکی

عشق آوارہ ہے صحرائے غمِ ہستی میں
عقل معصوم مگر آبلہ پا ہو نہ سکی

دِل مہکتا ہو تو ہر پھُول مہک اُٹھتا ہے
کوئی بُو حاملِ خوشبوئے وفا ہو نہ سکی

بے طرح دیر و حرم راہ میں آئے انجم
شکر ہے ہم سے کبھی لغزشِ پا ہو نہ سکی

ہوا کا رُخ ہی کچھ ایسا تھا ہم بھی بھانپ گئے
جلے چراغ تو سائے بھی کانپ کانپ گئے

صبا کو قید کرو نکہتوں کو پھیلاؤ
اس اہتمام سے گلشن کے پھول ہانپ گئے

یہ ہم سے پُوچھو کہ کھائے ہیں ہم نے زخمِ بہار
صدائے غنچہ پہ کیوں اپنے ہونٹ کانپ گئے

یہ نعشِ گُل یہ جنازے چمن پرستوں کے
کفن میں کانٹوں کی نشتر زنی کو ڈھانپ گئے

تری جبیں کے شکن نے بتا دیا سب کو
مآلِ عرضِ تمنّا کا لوگ بھانپ گئے

ہمارے پائے طلب کی یہ ہیئتیں انجم
کہ بحر خشک ہوئے اور پہاڑ کانپ گئے

ذہن سکرات کی کیفیت سے ہے شل
رُوح بے چین ہے جسم ہے مضمحل

ہو سکے گا کہاں تک حریفِ اجل
زہر کی جھیل میں زندگی کا کنول

اے غمِ زندگی! اے غمِ زندگی!
ایک لمحہ مسرّت کا بس ایک پَل

اے نسیمِ حیات، اے ہوائے طرب
اس طرف بھی تو آ، اس طرف بھی تو چل

مَیں کہ تھا رونقِ بزمِ مہر و وفا
سرد مہری سے ہوں جاں بلب آجکل

کتنی بے رُوح ہے آج کی چاندنی
کتنی یخ بستہ ہے زندگی آجکل

گیت گاتے ہُوئے ہونٹ پتھرا گئے
ڈھل گئی آنسوؤں میں غزل کی غزل

جو سہارا بناؤ وہ اِک وہم ہے
کتنا بے رحم ہے زندگی کا عمل

ایک مدت کے بچھڑے ہوئے دوست تھے
زندگی سے گلے مِل رہی ہے اجل

دیکھو کہ ہم حریفِ اجل بن کے جی لئے
آتش کدہ میں شاخِ کنول بن کے جی لئے
وہ زلزلہ کہ زیرو زبر ہو گیا جہان
کچھ لوگ پھر بھی تاج محل بن کے جی لئے
چنگیز لوٹتے رہے حُسنِ عروسِ فن
ہم پاسبانِ نازِ غزل بن کے جی لئے

○

خِرد کی پاسبانی میں خیالِ دین و دنیا ہے
مگر تیری تمنّا آج بھی تیری تمنّا ہے

وہی اک زہرِ غم ہے خندۂ لب ہو کہ آنسو ہو
کبھی ہونٹوں سے جھلکا ہے کبھی آنکھوں سے ٹپکا ہے

یہ دھوکا ہے تو پھر دیر و حرم والے ہی سمجھا دیں
یہاں تو عکسِ روئے دوست پیمانہ میں دیکھا ہے

وہی اِک تلخیٔ مرگِ تمنّا جاگ اٹھتی ہے
کوئی مجبورِ غم جب خواب کی دنیا میں ہنستا ہے

نہ وہ رشکِ زہرہ جبیں ہے اور نہ رشکِ مہر و مہ انجم
اسے تو ہم نے بس انسان کے قالب میں دیکھا ہے

حال کچھ ایسا بُرا بھی نہیں اچھّا بھی نہیں
ہم نے اس باب میں سچ یہ ہے کہ سوچا بھی نہیں

بارہا اپنے ہی دروازے پہ دستک دی ہے
روزنِ در سے کسی نے ہمیں جھانکا بھی نہیں

ہم پہ اس شخص سے الزامِ رہ و رسم رہا
آج تک جس کو کبھی خواب میں دیکھا بھی نہیں

اجنبی بن کے رہے اپنے ہی گھر میں انجم
آشنا اپنے لئے اپنی تمنّا بھی نہیں

○

خار نے دامن تھام لیا ہے پھول نے جام تراشے ہیں
ذوقِ نظر نے قدم قدم پر سو سو دام تراشے ہیں

شیشہ و ساغر بادہ و ساقی مطرب و نغمہ نکہت و نور
فکر و نظر نے حرص و ہوا کے کیا کیا نام تراشے ہیں

فطرتِ انساں دل کی تسلی دیر و حرم میں ڈھونڈ رہی ہے
صدق و یقیں کی آڑ میں ہم نے کیا اصنام تراشے ہیں

بندہ پرور غور تو کیجے فرصتِ ہستی کتنی تھی
آپ ہی سوچیں آپ نے کس پر یہ الزام تراشے ہیں

حسن کی فطرت کو سمجھا ہے ذوقِ گنہ کی داد تو دو
واعظ بے چارہ کیا جانے کیوں اصنام تراشے ہیں

صبح کا منظر، دودھ کی نہریں، حور کے جلوے، خدمتِ غلماں
ذہنِ رسا نے اپنے انجمؔ کیا اوہام تراشے ہیں

سینۂ سنگ شرر سے عاری
قلبِ آئینہ صفا سے محروم

خواب ہے اطلس و کمخواب کی بات
بنتِ زہراؑ ہے ردا سے محروم

حسن آئینِ حیا سے غافل
عشق آدابِ وفا سے محروم

راہبر آپ ہی گم کردۂ راہ
خضر خود آبِ بقا سے محروم

○

مہیب رات ہواؤں میں سم کی تلخی ہے
ہنسی میں چاند کی زہرابِ غم کی تلخی ہے

مری وفا میں ہیں خود بینیوں کے سنّاٹے
ترے عتاب میں لطف و کرم کی تلخی ہے

اِس ارتباطِ بہم کا کوئی جواب نہیں
ترے لبوں پہ مری چشمِ نم کی تلخی ہے

ہمیں تو موت کے پہلو میں بھی اماں نہ ملی
یہاں بھی ایک جوارِ کرم کی تلخی ہے

یہ مسکراتا ہوا موت کا حسیں چہرہ
اک اور زیست کے آغازِ غم کی تلخی ہے

اک اجنبی سی اداسی کی چاپ سنتا ہوں
مسرتوں میں بھی مرگِ الم کی تلخی ہے

فرازِ جنتِ آدم پہ اک زمانے سے
ہنوز جنبشِ لوح و قلم کی تلخی ہے

آج پھر اشک مری آنکھ میں بھر آئے ہیں
یہ سمندر بھی سفینوں میں اُتر آئے ہیں

کتنے بھولے ہوئے کتنے دبائے ہوئے درد
اُلجھے اُلجھے ہوئے خوابوں میں نکھر آئے ہیں

ہم تو اس وادیٔ بے نور سے یوں ہی گزرے
چاند سورج لئے اب شام و سحر آئے ہیں

اُس کی زُلف کی خوشبو ہر طرف بسی ہوتی
وقت کے جہنم نے سانس روک لی ہوتی

کوئی درد جاگ اٹھتا کوئی داغ جل اُٹھتا
کوئی تو صدا ہوتی، کچھ تو روشنی ہوتی

مصلحت کی وادی میں ہر طرف ہے سنّاٹا
جرأتِ تمنّا سے رُت بدل گئی ہوتی

خیر وہ جفاؤں پر منفعل تو کیا ہوتے
ہونٹ لاکھ سِل جاتے بات تو کہی ہوتی

برف کے ستونوں میں گرمیٔ وفا معلوم
ان کی سرد مہری ہی راس آگئی ہوتی

شہر کے دَر و دیوار آئینہ دکھاتے ہیں
گردِ رُخِ مسافر کی کاش ڈھل گئی ہوتی

اذنِ لب کشائی پر کیا خیال ہے انجمؔ
ہم نے سچ کہا ہوتا اُس نے داد دی ہوتی

○

دیکھا تو اپنی ذات میں بھی دو رُخی ملی
کچھ زندگی میں آرزوئے مرگ بھی ملی

اُونچے محل بنائے تو جی دھک سے رہ گیا
ہر بام و دَر پہ مرگ ہمیں جھانکتی ملی

جو بات ساری عمر زباں پر نہ آ سکی
وہ بات سارے شہر میں اُڑتی ہوئی ملی

○

جب بھی ہم نے شمع جلائی
آندھی سی اِک جھوم کے آئی

پروانو! کچھ سوچ کے جلنا
دیپک اپنے، جوت پرائی

بڑی کٹھن ہے وقت کی منزل
یاد تمہاری آئی نہ آئی

برکھا رُت کا سندیسہ سُن کر
کلی کلی کی آنکھ بھر آئی

جھوٹی آس پہ کب تک جینا
اوس سے کس نے پیاس بجھائی

جتنا اس کے پاس ہُوا ہوں
اور بڑھا دردِ تنہائی

انجمؔ وقت بڑا نازک ہے
منہ سے نکلی بات پرائی

پھر ہے احساسِ آگہی ساقی
ایک دو گھونٹ اور بھی ساقی

گھٹتا جاتا ہے خطِ پیمانہ
بڑھتی جاتی ہے تشنگی ساقی

ہر طرف تیرگی برستی ہے
لا تو شیشہ میں چاندنی ساقی

آج کیا بات ہے کہ موجِ شراب
آنسوؤں میں بدل گئی ساقی

آج کیا بات ہے کہ ساغر میں
بُو ہے انساں کے خون کی ساقی

آج کیا بات ہے کہ پی کر بھی
زندگی مات کھا گئی ساقی

ذکرِ مے کے بغیر بن نہ سکی
بات دُنیا میں خُلد کی ساقی

مے کدے پر بھروسہ تھا
رونقیں ہیں لُٹی لُٹی ساقی

(۷)

نغمہ و ساز سے میں دل کبھی بہلا نہ سکا
تجھ سے ہٹ کر میں کبھی ہنس نہ سکا گا نہ سکا

خیر مقدم کو بڑھیں لاکھ نگاہیں لیکن
لذتِ نیم نگاہی تری میں پا نہ سکا

پُرسشِ غم پہ بھی اِک لفظ نہ نکلا منہ سے
اپنی محرومیٔ تقدیر کو شرما نہ سکا

کتنی نظروں نے دیئے مجھ کو سہارے لیکن
اس کو کیا کہیئے کہ میں ہاتھ بھی پھیلا نہ سکا

گرم سانسوں نے چھُوئی بارہا یخ بستہ جبیں
پھر بھی افسردہ طبیعت کو میں گرما نہ سکا

بھُول جانے کی یہ تاکید بجا ہے لیکن
دِلِ مجبور کو سمجھایا پہ سمجھا نہ سکا

غنچوں کا جگر چاک ہُوا دستِ صبا سے
گل زخم چمن ہیں تو بہاروں کی بلا سے

ایک ایک کڑی پاؤں پڑی اہلِ جنوں کی
بیعت ہوئی زنجیر مری لغزشِ پا سے

مُردہ کوئی کہلائے کوئی زندۂ جاوید
کچھ تیرِ قضا سے مرے کچھ تیغِ ادا سے

تُو کس کا خدا ہے کہ جبیں گھس گئی اپنی
پتّھر بھی پگھل جاتے ہیں سجدوں سے، دُعا سے

زنداں پہ گرے دیکھیے یا راج محل پر
شعلہ تو لپکتا ہُوا اٹھتا ہے قضا سے

یہ کعبہ تھا یہ دیر میں جاتا تھا کدھر کو
وہ تو یہ ہُوا بات بنی لغزشِ پا سے

گُونجے مرے نالے در و دیوار سے انجم
پتّھر بھی صدا دے اُٹھے مضرابِ نوا سے

○

کتنے بھولے ہوئے دُکھ کتنے دبائے ہوئے زخم
اُلجھے اُلجھے ہوئے خوابوں میں نظر آتے ہیں

کتنے آنسو کہ جو شرمندۂ دامن نہ ہوئے
مسکراتے ہوئے ہونٹوں پہ نکھر آتے ہیں

زندگی جن سے عبارت ہے وہ رنگین لمحے
وقت کی رو پہ دبے پاؤں گزر جاتے ہیں

آنکھ لگتی ہے تو کچھ زخم سُلگ اُٹھتے ہیں
آنکھ کھلتی ہے تو کچھ درد اُبھر آتے ہیں

ہم ایک کہنہ و فرسودہ داستاں ہی سہی
تم اِک فسانۂ رسوائی جہاں نہ بنو
یہ قہقہے بھی گوارا مگر خدا کے لئے
دُکھی دلوں کے لئے باعثِ فغاں نہ بنو
زمیں کھینچ ہی لیتی ہے سب کو اپنی طرف
ہوائے جوشِ مسرت میں آسماں نہ بنو

نظمیں

تخلیق

میں اب سے ہزاروں برس پہلے پیدا ہوا تھا
بڑا بوجھ تھا جسم کا بار تھا
سرد تاریک مٹی کا تودہ مرا خول تھا
مسکراتا ہوا درد دکھ کی کٹھن منزلوں سے گزرتا ہوا
مَیں حسیں تھا —— جواں تھا
مِرے دکھ کا مفہوم بھی تھا
اندھیروں میں اک روشنی کی کرن ڈھونڈنا اور ہزاروں خداؤں کے
ڈھیروں سے اک بے نہایت خدا ڈھونڈنا
میرا منصب بنا تھا
خدا جس نے جسموں کی تخلیق کی تھی
بدن عارضی تھے کوئی عارضی شے حسیں بھی نہیں ہے
خدا جس نے روحوں کو پیدا کیا تھا
نہایت حسیں شغل تھا اس خدا کا
وہی شغل میرا تھا
مَیں اپنے خالق کے نقشِ قدم پر چلا تھا
مری روح نے اپنے خالق کے انداز پر
حُسن کے کتنے نقشے اتارے
محبت، خدا، دین، انسانیت
سب مرا اختراع تھے

یہی حُسن تھا اور اس حُسنِ تخلیق کی منزلوں میں
خدا ہی کی منزل تھی میری بھی منزل

دھرتی کا بوجھ

میرا ساتھی
اپنے کندھے پر ڈنڈے میں اک گٹھڑی لٹکائے
ہارے جی سے اور بوجھل قدموں سے چلتا جائے
ایک قدم ——
پھر رک جائے
ایک قدم ——
پھر رُک جائے
اُس کے بدن پر میلے چیتھڑے
اور بدن بھی میلا
میلی کھال کے خول کے اندر ایک تعفّن
گندھی اکھڑی سانس سے خود اس کا جی متلائے
مَیں نے دیکھا
وہ مڑ مڑ کر اپنی گٹھڑی کو جب دیکھتا ہے
اس کی پھیکی آنکھوں پر چھا جاتے ہیں
کچھ خوف کے سائے
جیسے اس گٹھڑی کے اندر
کالے ناگ بھرے ہوں پھن پھیلائے
وہ رُک جاتا ہے
لیکن وقت کہاں رُکتا ہے

اس کی رَو میں سب بہ جاتے ہیں

ہم تم سب
پاؤں چلیں یا وقت چلے
اس دھرتی کا بوجھ کبھی تو ہلکا ہونا ہے

مادرِ مہرباں

مری شفیق ماں
تری کنارِ بے کراں سے میں بچھڑ کے رہ گیا
یہ راستے یہ منزلیں یہ مرحلے یہ مشکلیں
یہ سنگ و خشت و خار و خس
لہو لہان جسم و جاں
مری شفیق ماں
مجھے تو یہ گمان تھا
کہ ایک دو گھڑی یہاں
تماشا ہائے رنگ و بُو سے
جسم و جاں بساؤں گا
مگر —— یہ میرا وہم تھا
یہ اک خیال خام تھا
مَیں تیری گود سے بچھڑ کے کس جہاں میں آ گیا
یہ ایک شہر اجنبی
ہر ایک شے نئی نئی
نہ کوئی میرا ہمسفر نہ کوئی میرا ہم قدم
ہر ایک چیز اپنی جا پہ منجمد کھڑی رہی
کسی کو کچھ غرض نہیں
مَیں روؤں یا ہنسوں یہاں

مری عظیم ماں

مجھے خبر ہے تیرے کتنے نورِ چشم
میرے کتنے نورِ چشم
میرے کتنے بھائی بند
تیرے مہرِ بے کراں کی گود میں سمٹ گئے

میری پُر وقار اور عظیم ماں
مجھے بھی اپنی گود میں اٹھا
(یہاں تو اب سکت نہیں کہ اک قدم بھی چل سکوں)
لہو لہان پاؤں دیکھ
چٹختی ہڈیاں — یہ گردِ ماہ و سال
میرے رُوکھے جھڑتے بال دیکھ
میرے سر پہ ہاتھ پھیر
مَیں ایک طفلِ بازیافتہ کی طرح
چند سسکیاں بھروں
لپٹ کے تجھ سے سو رہوں

منزلیں

وقت کی رَو پہ چلا قافلۂ تیز قدم
منزلیں گرد کے پردوں میں چھپی جاتی تھیں
شوق کہتا تھا کہ دو چار قدم اور سہی
راہِ پُرخار کے یہ پیچ یہ خم اور سہی
برق و باراں کے یہ اندازِ ستم اور سہی

دفعتاً راہ میں طوفانِ حوادث اٹھے
دیکھتے دیکھتے بجھنے لگے منزل کے چراغ
آندھیاں ٹوٹ پڑیں لوٹ کے محفل کے چراغ
تھا اگر کوئی سہارا تو فقط دل کے چراغ

ان چراغوں میں کوئی صاحب اعجاز اٹھا
اپنی رفتار میں اندازِ تگ و تاز لئے
جرأتِ شوق لئے ہمتِ پرواز لئے
دَرد کا ساز لئے عشق کا اعجاز لئے

مشعلیں تیر گئیں رات کی تاریکی میں
فاصلے ٹھہر گئے راہ میں دم لینے کو
منزلیں اٹھیں مسافر کے قدم لینے کو
برکتِ دامنِ ارباب ہمم لینے کو

قائدِ قافلۂ شوق کا اعجاز قدم
برف کی طرح پگھلنے لگا ہر کوہِ گراں

دلِ مُردہ میں اُبھرنے لگا اِک عزمِ جواں
بدلا بدلا نظر آنے لگا اندازِ جہاں
آج ہیں راکبِ تقدیرِ زمانہ ہم لوگ
اور کل تک تھے فقط ایک فسانہ ہم لوگ

ایک تصویر

مَیں نے تم کو دیکھا تو ہے
لیکن اب کچھ یاد نہیں
کب دیکھا ہے کہاں دیکھا ہے
پھر بھی
ان جانی پہچانی آنکھوں کے آئینوں میں
یہ دُبلا پتلا خوش باش جواں
کون ہے ؟
ہاں مَیں نے اس کو پہلے دیکھا ہے
اب یاد آیا
اس کی باتیں
کتنی میٹھی
کتنی چنچل
کتنی خوش کن ہوتی تھیں
اس کے ساتھ کا اک اک لمحہ
جیسے پھول بکھرتے ہوں
جیسے جھرنے گرتے ہوں
لیکن تم آنکھیں مت جھپکو
(بس یوں ہی ساکت سامت آنکھوں سے دیکھو)
پلک جھپکتے صدی بدل جاتی ہے

تم نے پھر آنکھیں جھپکیں
اب اس کا وہ پھول سا چہرہ
چنچل آنکھیں
سانس کی خوشبو
سب کچھ ایک فسانہ
مُرجھائے ہوئے اُترے چہرے پر
یہ گردِ زمانہ
اُلجھے بال سلگتی باتیں
اندر دھنسی ہوئی بے نور سی آنکھیں
ایک ہونق بوڑھا سا، یہ کون کھڑا ہے
کیا یہ مَیں ہُوں
ہاں مَیں نے تم کو پہچانا

رگِ سنگ

تم مرے کرب کے ہر روپ کو جھٹلاتے ہو
مسکراہٹ ہو کہ آنسو ہو
خموشی ہو کہ چیخ
خواب ہو عالمِ افکار کی رعنائی ہو
میری آنکھوں کی چمک ہو کہ فسردہ چہرہ
مری بے ربط سی باتیں
مری تخلیق —— غزل
"قطرۂ خونِ جگر"
اس پہ "سب جھوٹ ہے" لکھ دیتے ہو

کون اس کرب سے آزاد رہا؟
تُم کہ مَیں
یا کوئی اور یہاں
سامنے میز پہ رکھے ہوئے گل داں کے قریب
میرے کمرے کی وہ تصویر —— وہ مُونا لیزا
جِس نے اک کرب تبسّم کی سزا پائی ہے
آج تک دار پہ کھینچا ہوا یہ نقشِ جمیل
کرب کے روپ سے آزاد ہے کون؟

یہ مری سادہ دلی
تم کو سمجھاؤں
کہ تم ہاتھ سے پتھر چھوڑو
سنگ و تیشہ کی اس آویزش میں
کون جانے کہ رگِ سنگ سے پھوٹے گا لہو!

دستک

دل کے در پر دستک دی
اندر سے آواز یہ آئی
کون ہے بھائی؟
اس سِل کے سوراخ سے اندر جھانکو
دیکھو دیواروں کا رنگ اڑا ہے
ملبہ کا اک ڈھیر پڑا ہے
ٹوٹا پھوٹا بوسیدہ سا اجڑا گھر ہے
ایسے گھر میں کون رہے گا؟
تم کس سے ملنے آئے ہو
مجھ سے؟ —— مَیں تو مدّت گزری
اس گھر کا مہمان رہا ہوں
مدت گزری یہ گھر مری جائے پناہ تھا
سب کے لئے یہ دارالاماں تھا
سب کے لئے یہ سینہ سپر تھا
اس کے آگے کڑی کمانیں جھک جاتی تھیں
آگ اُگلتی توپیں رُک جاتی تھیں
اس کے در و دیوار سے خوشبو کی نہریں بہتی تھیں
راگ اور روپ کا مندر تھا یہ گھر
سچائی کا ساگر تھا یہ گھر

اک دن میں نے
گھر کے دروازے پر یہ آواز سنی
پرانے دیوں سے نئے چراغ خریدو
مَیں نے ایک پرانا دیا بدل کر نیا چراغ خریدا
بس پھر کیا تھا
روپ نگر میں بھوتوں کے جے کارے گونجے
پھر اس کی دیواروں کا رنگ اُڑا
ملبہ کا اِک ڈھیر لگا
تاریکی کا ڈیرا ہے
کون یہاں اب میرا ہے؟

خودکشی

آج میں بھی غم و آلام مٹا ڈالوں گا
آج دل ایسے دھڑکتا ہے کہ جیسے اک بار
پھر وہی ہاتھ مرے سینے پہ آ جائے گا
وہی باہیں میری گردن میں حمائل ہونگی
کوئی افسانہ سنا کر مجھے بہلائے گا

اس سے دیکھا نہیں جائے گا مرا حالِ تباہ
چند آنسو مرے دامن پہ بکھر جائیں گے
کچھ بہاریں مرے پہلو میں سمٹ آئیں گی.
جیسے سچ مُچ اسے احساسِ ندامت ہوگا
ایک مُجرم کی طرح سر بگریباں ہوگی
جیسے بیتے ہوئے لمحوں کا خیال آئے گا
جیسے وہ اپنے تغافل پہ پریشاں ہوگی
آج میں تلخیِ ایام مٹا ڈالوں گا
آج اِک زہر میں ڈوبا ہوا نشتر ہی سہی

خواب میں بھی وہی سنگین حقیقت کے نقوش
ٹوٹا جاتا ہے تصوّر کا طلسمِ رنگین

وہی شاداب سے چہرے وہی گل گشتِ چمن
ایک آنسو بھی میرے نام کا دنیا میں نہیں
پھر بھی میں تلخیٔ ایام مٹا ڈالوں گا
آج اک زہر میں ڈوبا ہوا نشتر ہی سہی

چھ ستمبر کی سحر

جب مری ارضِ مقدس پہ ہوئی سایہ فگن
تپ کے کندن میں بدلنے لگے سونے کے بدن
خاک اکسیر میں ڈھلنے لگی پروانوں کی
بات بنتی نظر آنے لگی دیوانوں کی
عزم و جرأت کے نشاں لے کے علمدار بڑھے
سبز پرچم کے تلے حق کے پرستار بڑھے
روحِ غازی کی حرارت سے وطن جاگ اٹھا
سُرخیٔ خونِ شہیداں سے چمن جاگ اٹھا

چھ ستمبر کی سحر —— عزم و عمل کی پیکر

عشق کی دولت بیدار لٹاتی آئی
تفرقہ ہائے من و تو کو مٹاتی آئی
وطنِ پاک کا ہر پیر و جواں جاگ اٹھا
لے کے انگڑائی ہر اک شیرِ ژیاں جاگ اٹھا
بحر و بر جاگ اٹھے ساری فضا جاگ اٹھی
تازہ پھر ہونے لگا معرکۂ بدر و حنین
آفریں ضربِ علیؑ - مرحبا صبرِ حسینؑ

چھ ستمبر کی سحر —— سجدہ گہِ شمس و قمر

جس میں اقبال کے ہر خواب کی تعبیر ملی
پرِ شہباز ملا قوّتِ شمشیر ملی

قوم اک سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنی
مردِ مومن کی نظر واقعی تلوار بنی
سرنگوں ہوتی ہوئی کفر کی کثرت دیکھی
پھر سے تاریخ نے اسلام کی قوت دیکھی
ہے وہی شان مسلمان کی تکبیروں میں
بجلیاں کوندتی ہیں آج بھی شمشیروں میں

چھ ستمبر کی سحر ——— قوّتِ دستِ حیدرؓ

پھٹ پڑے موت پہ اسلام کے شاہین شہباز
آفریں جوششِ عمل، مرحبا حُسنِ پرواز
کنگرے گرنے لگے عقل کے ایوانوں کے
خواب شرمندۂ تعبیر ہیں دیوانوں کے
کفر و الحاد کے اک سیلِ رواں کو روکا
ہم نے فولاد کے اِک کوہِ گراں کو روکا
راہ مولا میں شہادت کے طلب گار بڑھے
وہ غلامِ علیؓ حیدرِ کرّار بڑھے

مرثیہ

جب حسنِ لم یزل ہوا آمادۂ نمود
ہونے لگا شعاعِ تجلّی کا یُوں ورود

ذرّے چمک کے بن گئے آئینۂ شہود
نکلا عدم کے پردے سے باہر رُخِ وجود

دستِ وجود شاہدِ ارض و سما ہُوا
ہر شے میں حسنِ جلوۂ لا انتہا ہُوا

زینت دہِ فلک ہوئے خورشید و ماہتاب
آبِ رواں کی گود میں رقصاں ہوئے حُباب

پیدا ہوئے پھر عالمِ بے حدّ و بے حساب
گلزارِ ہست و بود پہ آنے لگا شباب

حکمِ ازل کی اس طرح تعمیل ہو گئی
آدم کی ذات باعثِ تکمیل ہو گئی

صنعت پہ اپنی جھُوم اٹھا صانعِ ازل
تھا حکم قدسیوں کو جھکیں آ کے سر کے بل

ابلیس کے دماغ میں پیدا ہوا خلل
کہنے لگا کہ "سجدۂ آدم کو کیا محل"

تو خوب جانتا ہے میں آتش نژاد ہوں
کیا ایک مشتِ خاک سے بھی کم سواد ہوں

انکار سجدہ کر کے وہ مردُود ہو گیا
ہر راستہ نجات کا مسدُود ہو گیا

اشرارِ بد خصال میں محدود ہو گیا
شدّاد بن گیا کبھی نمرود ہو گیا

انسانیت پہ تیغِ ستم تولتا رہا
ہر اہرمن کی بن کے زباں بولتا رہا

دورِ زماں میں گردش شام و سحر ہوئی
ظلمت حریفِ جلوہ شمس و قمر ہوئی

نیکی بدی میں نسبت تیغ و سپر ہوئی
دنیا تمام منقسم خیر و شر ہوئی

کچھ بد نہاد پیروِ شیطان ہو گئے
کچھ حق پرست خیر پہ قربان ہو گئے

اعلانِ حق یہ کفر کے تیور بدل گئے
تیغیں اُپیں کہیں کہیں نیزے سنبھل گئے

دار و رسن سجے کبھی شعلے مچل گئے
ہر معرکہ میں اہلِ خدا سر کے بل گئے

تائیدِ ایزدی کا یہ ادنیٰ کمال تھا
باطل کو حق کا سامنا کرنا محال تھا

مردانِ حق میں صاحبِ سیف و قلم اٹھا
ہر آن جس کا راہِ خدا میں قدم اٹھا

باطل کی بادِ تُند کا آخر بھرم اٹھا
دشتِ عرب سے ایک سحابِ کرم اٹھا

ہر سمت جس کے فیض کے چشمے رواں ہوئے
صحرائے خشک رو کشِ باغِ جناں ہوئے

ذرّے تھے جس کی خاکِ کفِ پا کے آفتاب
تھا اور نہ ہو گا جس کا جہاں میں کوئی جواب

انسانیت کا عزمِ جواں زیست کا جواب
خلقِ عظیم رحمتِ عالم، فلک جناب

جس کے غلام قیصر و کسریٰ شکار تھے
فصلِ خزاں میں مژدۂ بادِ بہار تھے

جس کی نظر کے فیض سے ذرّے گہر بنے
پامال خلق رو کشِ شمس و قمر بنے

تیرہ نہاد صاحبِ قلب و نظر بنے
جو خاکِ پا کو چھو گئے اکسیر گر بنے

پھر وہ جنہیں خود آپ کہیں اپنا نورِ عین
اس مرتبہ پہ کوئی بھی ہے ماسوا حسینؓ

لختِ جگر حضورؐ کے، زہرا کے نورِ عین
شیرِ خدا کے لال، شہنشاہِ مشرقین

بھائی حسنؓ کے حضرت زینب کے دل کے چین
پیکرِ رضا کے صبر کے کوہِ گراں حسینؓ

دستِ خدا کے آئے بھلا کون ٹھامنے
بولے گا کون مصحفِ ناطق کے سامنے

میدانِ کربلا میں شہادت حسینؓ کی
خنجر کی باڑھ پر رگِ غیرت حسینؓ کی

حاصل عبادتوں کا عبادت حُسین کی
دینِ مبین کے حق میں عنایت حسین کی

سارا غرور خنجرِ آہن نچوڑ کر
فولاد رکھ دیا رگِ گردن سے توڑ کر

نیزے پہ سر بلند ہوا فرقِ آفتاب
جھلکی شعاعِ نُور سے ذرّوں میں آب و تاب

باطل کچھ ایسے ٹوٹ گیا جس طرح حُباب
اللہ رے سر بلندیٔ ابنِ ابُو تراب

صدیوں سے حق پرستوں میں زندہ حسینؑ ہیں
گمراہی سے نجات دہندہ حسینؑ ہیں

...... کے نام

تم خونِ اعتمادِ وفا کر کے خوش رہو
ہم کو یہ اذنِ دل کہ دعا کر کے خوش رہو

کہنہ شجر کے سائے کا احسان کیا ضرور
تم اس کی شاخ شاخ جُدا کر کے خوش رہو

ہم ایک ایک درد تمہارا سمیٹ لیں
تم ایک ایک درد عطا کر کے خوش رہو

اللہ تمہیں بچائے زمانے کی دھوپ سے
سایہ ہمارا سر سے جُدا کر کے خوش رہو

کچھ دیر اور ہم کو فریب حیات دو
کچھ اور ہم سے عہدِ وفا کر کے خوش رہو

انجم رضائے دوست کے پہلو عجیب ہیں
آدابِ زخمِ شوق ادا کر کے خوش رہو

ایک نظم

بات کہتے ہوئے کچھ سوچ کے رک جاتا ہوں
اور یوں بھی نہ بنی بات تو پھر کیا ہوگا
مدتوں اپنے ہی لب اپنی ہی سوزن سے سیئے
مدتوں زہرِ خموشی سے بھرے جام پیئے
مدتوں کتنی ہی احساس کی سرکش لہریں
سرد ہونٹوں پہ رکیں گرم نگاہوں میں ڈھلیں
آہ تک بن نہ سکیں ایک پلک چل نہ سکیں
عقل کو ساتھ لیا ذہن کے سانچے بدلے
شکوۂ تلخیٔ دوراں بھی کیا دیکھ لیا
اور احساسِ گرانباریٔ زنجیر بڑھا
ذہن و احساس کی پُر پیچ گزرگاہوں کے
پیچ و خم بڑھتے گئے رات اُلجھتی ہی گئی
اور تنہائی کے لمحوں میں کوئی بول اُٹھا
تم تو کہتے ہو کہ شاعر ہو مگر یہ کیا ہے
بزدلی سنگدلی اور کسے کہتے ہیں
تم کو جو کہنا ہے وہ بات نہیں کہتے ہو
اور جو کہتے ہو وہ بات نہیں کر سکتے

پہلی تاریخ

پہلی تاریخ کا ہے پھر ہنگام
لوگ پھر کر رہے ہیں مجھ کو سلام

ہم سمجھتے ہیں اِن سلاموں کو
اِن سے بڑھ کر نہیں کوئی دُشنام

ہے تقاضا کا یہ حسین انداز
قرضخواہوں کا ہے یہ طرزِ کلام

چل کے دفتر سے گھر تک آتے ہیں
پڑتے ہیں راستے میں کتنے مقام

رُکنے لگتے ہیں ہر دُکاں پہ قدم
گھٹتے جاتے ہیں اپنی جیب میں دام

گھر میں آتے ہیں جب قدم اپنے
اور بڑھتی ہے گردش ایّام

پھر خط آیا ہے دونوں بیٹوں کا
وہی آغاز اور وہی انجام

ایک کو تین سو کی حاجت ہے
دوسرے کا چلے گا سو میں کام

تین تاریخ تک کی مہلت ہے
ورنہ کالج سے کٹ چکے گا نام

جُھک کے خیّاط نے سلام کیا
نوکِ سوزن ہے اس کا یہ پیغام

آ گیا ہے بزاز کا رقعہ
اِس مہینے چکائیے سب دام

دُودھ والے کا بِل معاذ اللہ
کِس قدر تلخ ہے یہ لذّتِ کام

اور بیوی کا فلسفہ ہے جُدا
اُس کو اِس لین دین سے کیا کام

ساری اشیائے خوردنی لاؤ
ورنہ گھر کا چلے گا کیسے کام

ابنِ آدم ہُوں کیا کروں آخر
اور گندم کے چڑھ رہے ہیں دام

مانگتے ہیں معاوضہ اپنا
مہترانی، ملازم و حجام

ایک تنخواہ اور لاکھوں خرچ
ایک دانہ اور اِتنے سارے دام

اوس سے کیا بجھے گی پیاس اپنی
اِن سہاروں سے کیا چلے گا کام

کٹتے رہتے ہیں یُوں ہی دن اپنے
ہوتی رہتی ہے یُوں ہی صبح شام

پُوچھتے کیا ہو کیسے زندہ ہُوں
خودکشی اپنے دین میں ہے حرام

پروفیسر اشرف بخاری کے نام ایک منظوم خط

میرے اشرف مرے پیارے اشرف — حال کیسے ہیں تمہارے اشرف
بعد مدّت کے ترا خط آیا — نغمۂ دل کے لئے بربط لایا
میری جانب سے دُعائیں پہنچیں — دلِ مہجور کی آہیں پہنچیں
خوش رہو اہلِ وطن میں اپنے — ہم صفیرانِ چمن میں اپنے
بعدہٗ پہنچے سلامِ انجم — اس بہانے ہی کلامِ انجم
قمریِ سروِ پشاور کو سلام — طوطیٔ آئینہ پیکر کو سلام
شہرِ نوشہرہ کے دلبر کو سلام — صدفِ علم کے گوہر کو سلام
شکوۂ اہلِ وفا بھی سُن لے — یعنی تھوڑا سا گلہ بھی سُن لے
"بستنِ عہدِ وفا" لا حاصل — شکوۂ جور و جفا لا حاصل
گردشِ ساغرِ ایّام نہ پُوچھ — زہر آلودگیٔ جام نہ پُوچھ
آتش افروزیٔ احساس مپرس — چشمک آرائیٔ صد یاس مپرس
حاصلِ عرضِ تمنا معلوم — التفاتِ رُخِ زیبا معلوم
"خان صاحب" کا فسانہ مت چھیڑ — "بیگ صاحب" کا ترانہ مت چھیڑ
ہائے باتیں وہ "میاں صاحب" کی — ہوگئیں خواب نہ جانے کب کی
ہائے وہ رمز و کنایات کہاں — اب وہ "احوال و مقامات" کہاں
لائبریری کی فضا یاد آئی — مصحفِ رُخ کی ہوا یاد آئی
شعرِ مومن کو مجسّم دیکھا — جرأت و شوق کا عالم دیکھا
مثنوی میر اثر کی دیکھی — شاعری داغ و جگر کی دیکھی
شعرِ حافظ کی وہ تفسیریں تھیں — خوابِ خیّام کی تعبیریں تھیں

کبھی افسانہ و افسوں چھیڑا
قصۂ لیلیٰ و مجنوں چھیڑا

نشّۂ دورِ جوانی ہائے
مرزا رُسوا کی کہانی ہائے

وہ گلستاں کا بابِ پنجم
کیا کہیں کیسے پڑھائے انجم

اپنے اندازِ بیاں میں اکثر
میرؔ کے شعر کے سارے نشتر

ق

کبھی پہلو میں اتر جاتے تھے
کبھی پلکوں پہ سنور جاتے تھے

جام و ساغر کو چھلکتے دیکھا
ان کو باتوں میں بہکتے دیکھا

سر سے آنچل جو سرک جاتا تھا
ایک شعلہ سا لپک جاتا تھا

حسرتِ حرفِ برہنہ گفتن
رسم و آداب کے بھاری قدغن

الف لیلہ کی حکایاتِ جواں
گفتہ آید بہ حدیثِ دگراں

دیکھ کیا کیا مجھے یاد آتا ہے
دل کہیں اور لئے جاتا ہے

ناظم آباد کی پیاری بستی
ہائے کیا تھی وہ ہماری بستی

جس کی گلیوں میں تھی بُوئے فردوس
جس کا ہر کوچہ تھا کُوئے فردوس

جس کے غرفوں میں جلے دل کے چراغ
جگمگائے مری محفل کے چراغ

اب جو بھُولے سے اُدھر جاتا ہوں
سچ ہے بے موت ہی مر جاتا ہوں

اُجڑے اُجڑے سے وہ بام و در ہیں
سوگ میں ڈوبے ہوئے منظر ہیں

کھڑکیاں بند دریچے خاموش
پھُول افسردہ ستارے روپوش

چاند گہنا گیا تارے ڈوبے
سیلِ ظلمات میں سارے ڈوبے

وہ سحر اور نہ وہ شب آتی ہے
اب نہ کل آئے نہ جب آتی ہے

رسمِ اصنام پرستی نہ رہی
اب وہ بستی مری بستی نہ رہی

مضمحل ہو کے پلٹ آتا ہوں
دلِ ویراں میں سمٹ آتا ہوں

پہلی آزاد نظم

(۱۹۴۱ء)

سوچتا ہوں کہ کسی دن تجھے اِک خط لکھ کر
سازِ احساس کو زندہ کر دوں
منتشر نغموں کو یکجا کر دوں
پھر اسی سوچ میں کھو جاتا ہوں
شعلۂ ساز بھڑک اٹھے گا
سازِ احساس کا ہر تار شکستہ ہوگا
تھرتھرائیں گے وہ برفاب سے ہونٹ
نبضِ احساس بھی رُک جائے گی
سوچتا ہوں کہ کسی دن تجھے اک خط لکھ کر
اپنے کھوئے ہوئے لمحوں کو اکٹھا کر لوں
سوچ کی راہ میں سنگین پہاڑوں کے ستوں
برف کی طرح پگھل جاتے ہیں

نویدِ شادی

(عمران حسن صدیقی برادرِ نسبتی کی شادی پر)

یہ تقریبِ مبارک اللہ اللہ
مسرّت ہی مسرّت چار سُو ہے
یقیناً ہے یہ فیضِ حسنِ خورشید
کہ ہر اک چیز میں ذوقِ نمو ہے

نظر کھوئی ہوئی ہے رنگ و بُو میں
سمٹ آئی ہیں جنّت کی بہاریں
زمینِ بزم ثریّا بن گئی ہے
اتر آئی ہیں تاروں کی قطاریں

محبت جلوہ فرما ہے نظر میں
دلوں میں اِک سرور کیف آگیں
رُخِ عمرانؔ باری پر ہے سہرا
جہانِ آرزو ہے آج رنگیں

بہاروں پر مچلتی ہے جوانی
فضا میں ساز سے بجنے لگے ہیں
نویدِ شادی عمرانؔ سُن کر
جوانانِ چمن سجنے لگے ہیں

یہ ہے جلووں کی ارزانی کا عالم
زمانہ ہے فدائے روئے عمراںؔ
مہ و خورشید و انجم۔ تاجِ افلاک
شمیمِ گل، نسیمِ صبحِ خنداں

متفرق اشعار

نگاہ تیرگیٔ شب میں ایسی ڈوب گئی
ٹٹولنے پہ بھی اپنا بدن نہیں ملتا

ہنستے ہوئے دل فگار دیکھے ہم نے
شائستۂ زخمِ خار دیکھے ہم نے

پھولوں کے سروں سے تاج اُڑانے والے
کانٹوں میں بھی تاجدار دیکھے ہم نے

تعجیل کا زہر اب نہ گھولو یارو
تدبیر کے میزان پہ تولو یارو

نسخہ تو بہت تیز ہے لیکن پہلے
اجزائے خواص تو ٹٹولو یارو

دُنیا میں ہر اِک شخص اسی طرح جیا ہے
اِک زخم کریدا ہے تو اک زخم سیا ہے

حالات نے کِس کِس طرح مجبور کیا ہے
لیکن ترے غم نے بھی بڑا ساتھ دیا ہے

یہ ساحل والے کیا جانیں ہم کیسے یہاں تک آئے ہیں
ہر موج کا دامن چیرا ہے ہر طوفاں سے ٹکرائے ہیں

نہ جانے کونسی منزل میں کس دیار میں ہیں
مرے رفیق ابھی میرے انتظار میں ہیں

نہ تری زُلف کی خوشبو نہ ترے پاؤں کی چاپ
خبر نہیں ہمیں کس اجنبی دیار میں ہیں

کیا جانیئے وہ جانِ چمن جانے کہاں ہے
پھولوں کے تبسم پہ بھی اشکوں کا گماں ہے

وقت کے گھاؤ کا مرہم شاید
آپ کی چشمِ عنایت بھی نہیں

چُپکے رہنے پہ ھزاروں خدشے
لب کشائی کی اجازت بھی نہیں

دھیان کی رو پہ ذرا ٹھہر کے چل
ترے ماتھے پہ لگا دوں صندل

کوئی دم دل میں ٹھہرتے ہی نہیں
جس طرح رُوپ بدلتے بادل

اختتامیّہ

اُستادِ گرامی انجم صاحب

اگست ۱۹۷۶ء کے شروع میں پروفیسر محمد حیات خاں سیال کا ایک دلچسپ اور پُرخلوص خط ملا :-

"محترم انجم صاحب کے خلاف ایک "سازش" تیار کی ہے اور اس میں آپ کو بھی شامل کرنا ضروری سمجھا ہے۔ بڑی مشکل سے سو سو بہانے بنا کر کہ آپ کی شاعری پر مضمون لکھنا چاہتا ہوں۔ کچھ کلام جمع کر لیا۔ مختلف رسالوں کو چھان مارا۔ کچھ ردّی کاغذات ان کے گھر سے تلاش کئے۔ اب یہ انتخاب انشاء اللہ جلد ہی شائع ہو گا۔ کوشش یہ ہے کہ انجم صاحب کو اس وقت پتہ چلے جب ہم ان کے ساتھ ایک شام کی تقریب کا پروگرام بنائیں۔ آپ کو ان کی غزل پر مقالہ لکھنا ہو گا چاہے دو تین صفحے سہی لیکن انجم صاحب سے ملاقات ہو تو ان سے اس سلسلے میں کوئی بات نہ کی جائے کیونکہ وہ کلام کی اشاعت کے سلسلے میں الرجک ہیں۔"

یہ خط پڑھ کر میں اس سازش میں شرکت پر آمادہ ہو گیا لیکن بہت سی مصروفیات کی وجہ سے فوری طور پر کچھ نہ لکھ سکا۔ تاہم اس عرصے میں بھی کبھی انجم صاحب اور ان کی شاعری سے متعلق کچھ یادداشتوں پر سے ماضی کی گرد ہٹانے کی کوشش کرتا رہا۔

میں اسلامیہ ہائی سکول جھنگ میں پڑھتا تھا۔ غالباً چھٹی یا ساتویں جماعت میں تھا اور میرے بڑے بھائی خواجہ غلام کبریا گورنمنٹ کالج جھنگ میں ایف ایس سی کے طالب علم تھے۔ سال غالباً ۱۹۴۹ء کا تھا۔ ان دنوں پروفیسر انجم کا تقرر گورنمنٹ کالج جھنگ میں ہوا۔ ان سے انجم صاحب کا ذکر کئی مرتبہ سنا۔ ان کے انجم صاحب سے مراسم کالج کے روایتی معلم اور

متعلم کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھے۔ اس بنا پر میں کالج میں داخل ہونے سے کئی سال پہلے ہی انجم صاحب سے متعارف تھا۔ پھر میں جب ۱۹۵۴ء میں کالج میں داخل ہوا تو انجم صاحب کے ٹیوٹوریل گروپ میں تھا لیکن سائنس کا طالب علم ہونے کی وجہ سے ان سے پڑھنے کا موقع نہ ملا۔ آخر سائنس میں دو سال ضائع کرنے کے بعد جب بدقت مجھے آرٹس میں داخلے کی اجازت ملی تو انجم صاحب سے پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ چونکہ میرے پاس فارسی اختیاری تھی اور ضوابط کی رو سے اس کے ساتھ اردو اختیاری پڑھنے کی اجازت نہیں تھی، اس لئے مجھے بھی بڑے بھائی کی طرح اُردو آپشنل ہی میں انجم صاحب کی شاگردی اختیار کرنی پڑی حالانکہ میری خواہش تھی کہ اردو آپشنل کی بجائے اردو اختیاری ان سے پڑھوں۔ اردو آپشنل کی ہفتے میں صرف دو گھنٹے تدریس ہوتی تھی اور نصاب میں دیوانِ حالی شامل تھا۔ انجم صاحب نے ردیف الف سے پڑھانا شروع کیا۔ سال کے آخر تک بمشکل پندرہ بیس غزلیں پڑھی ہونگی۔ سبب یہ تھا کہ وہ تدریس کے لئے مثالی ماحول چاہتے تھے جو وہاں میسّر آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کالج کی عمارت سیلاب زدہ اور ٹوٹی ہوئی تھی۔ کمروں میں تاریکی دیواروں پر پھپھوندی جمی ہوئی۔ ڈیسک ٹوٹے پھوٹے، طلبہ بے توجہ۔ کمرے سے نجات حاصل کرنے کے لئے جنوری فروری میں کبھی کلاس دھوپ میں بٹھا لیتے جہاں طلباء کی توجہ کو بانٹنے کے اسباب اور بھی افراط سے میسّر آجاتے تھے۔ ایک دن کلاس گراؤنڈ میں لگی ہوئی تھی۔ ذرا آگے میدان میں ہاکی میچ ہو رہا تھا۔ ایک زوردار ہٹ لگی اور بال کلاس کے اندر۔ اس پر انجم صاحب مزید ضبط کے متحمل نہ ہو سکے اور یہ کہہ کر چلے گئے۔ "مَیں اس ماحول میں نہیں پڑھا سکتا" اور ایسے مواقع اکثر آتے رہتے تھے۔ تاہم ان پندرہ بیس غزلوں کو پڑھ کر مَیں نے انجم صاحب سے وہ کچھ سیکھا جو برسوں میں حاصل نہیں ہوتا۔ حالی کی غزل تو محض ایک بہانہ تھی۔ اس کے حوالے سے اردو غزل کے بہت سے علائم و رموز واضح ہوئے جو بعد ازاں غزل کے مطالعے میں بے حد مفید ثابت ہوئے۔

اس زمانے میں مَیں بھی شعر کہتا تھا۔ انجم صاحب سے مَیں نے چند غزلوں پر اصلاح بھی لی۔ یہ سلسلہ اس وجہ سے منقطع ہو گیا کہ مَیں اسی سال جھنگ سے لاہور آگیا۔ جھنگ کے قیام کے دوران مجھے انجم صاحب سے اشعار سننے کا اتفاق کم ہی ہوا۔ وہ مشاعروں میں بہت کم شریک ہوتے تھے۔ جھنگ کے شعراء میں ان کے سب سے زیادہ تعلقات مجید امجد کے ساتھ تھے۔ مجید امجد جھنگ آتے تھے تو ان دونوں کی طویل نشستیں ہوتی تھیں۔ مَیں ان میں بہت کم شریک ہوا ہوں لیکن جب بھی شرکت کا موقع ملا بالخصوص انجم صاحب کی گفتگو سے بے حد مستفید ہوا۔ مجید امجد بالعموم خاموش ہی رہتے تھے۔ زیادہ گفتگو انجم صاحب کرتے تھے۔ انہیں ادبیات، فلسفہ اور موسیقی سے بہت شغف تھا۔ فارسی اور اُردو کے ہزاروں اشعار ازبر تھے موقع محل کی مناسبت سے فوراً شعر پڑھتے تھے۔ کسی لفظ کی صحت پر بحث چھڑ جاتی تھی تو فوراً شعر سے سند دیتے تھے۔

بہت کم شعر کہتے اور جمع کرنے میں اس سے بھی زیادہ بے پروا تھے۔ انجم صاحب علی گڑھ کے فارغ التحصیل ہیں جہاں سے ایم۔ اے کا امتحان انہوں نے امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ علی گڑھ کے اساتذہ خصوصاً رشید احمد صدیقی اور آل احمد سرور کے نہایت عزیز شاگرد تھے۔ علی گڑھ کا ماحول شاعری سے معمور تھا۔ اس لئے ممکن نہیں کہ انہوں نے اس زمانے میں بہت کچھ کلام ارشاد نہ فرمایا ہو۔ میں نے ان سے کئی مرتبہ سنا ہے "نوجوانی میں بہت اچھے شعر کہا کرتا تھا" لیکن یہ سارا کلام ان کی طبعی کاہلی کی نذر ہو گیا۔ جھنگ میں وہ طویل عرصے سے مقیم ہیں۔ سوائے ملازمت کے ان چند برسوں کے جب انہیں لائل پور اور میانوالی میں رہنا پڑا وہ قیام پاکستان کے بعد سے آج تک جھنگ میں مقیم اور آجکل گورنمنٹ کالج جھنگ کے پرنسپل ہیں مگر مزاج میں کاہلی حد سے زیادہ ہے۔ اس لئے انہوں نے اپنی بے پناہ تخلیقی اور تنقیدی صلاحیتوں سے دنیائے ادب کو محروم رکھا۔

پروفیسر محمد حیات خاں سیال ہمارے شکریے اور تحسین کے مستحق ہیں کہ انہوں نے انجم صاحب

کا کلام جو کچھ بھی ممکن ہو سکا، مدون کر دیا۔

اس مختصر سے مجموعے نے میرے دل پر انجم صاحب کی شعری صلاحیتوں کا گہرا نقش بٹھا دیا ہے۔ وہ غزل کے علائم و رموز اور اس کے لہجے سے انحراف نہیں کرتے۔ کلاسیکی غزل کی حدود میں رہ کر نئی باتیں کرتے ہیں۔ اس لئے ان کی غزل میں چکا چوند نہیں۔ وہ ہمیں چونکاتے نہیں۔ غزل کا اسلوب کلاسکیت سے اس درجہ ہم آہنگ ہے کہ قاری سرسری نظر سے دیکھے تو اسے روایتی غزل کی بازگشت سمجھ سکتا ہے مگر تھوڑی سی توجہ کرے تو اسے معمولیات کے اندر معمول سے ہٹتے ہوئے مضامین نظر آئیں گے اور یہی انجم صاحب کا کمال ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :۔

ہم نے کیا کھویا کیا پایا کہنے کی یہ بات نہیں ہے
جیت کہیں تو جیت نہیں ہے مات کہیں تو مات نہیں ہے

کتنی سہولت سے ایک نادر بات کہی ہے۔ ہماری کلاسیکی غزل زندگی میں جیت کی قائل ہے یا مات کی مگر کتنی ہی زندگیاں یوں بسر ہوتی ہیں کہ نہ انہیں کوئی لائق رشک کامیابی نصیب ہوتی ہے اور نہ قابلِ ذکر ناکامی۔ ایسی ہی زندگی کا "المیہ" اس شعر میں بیان ہوا ہے۔ اس کی طرف ہمارے کسی اور غزل گو شاعر کی توجہ نہیں ہوئی یا کم از کم میرے علم میں نہیں ہے۔

اہلِ چمن کے تیور دیکھو جیسے کوئی بات نہیں ہے
اور چمن کا نقشہ یہ ہے پھول نہیں ہے، پات نہیں ہے

لوگوں کی بے حسی اور بے چارگی کو کس صفائی اور خوبصورتی سے بیان کیا ہے :۔

پھول اک اک کر کے کملاتے رہے
ہم بہاروں ہی کے گُن گاتے رہے

یہاں اس قسم کے لوگوں کا ذکر ہے جنہیں موقع پرست کہا جاتا ہے۔ جن کے لئے ہر خزاں بہار ہے۔

ہم وفا کر نہ سکے ان سے جفا ہو نہ سکی
ایک بھی رسم محبت کی ادا ہو نہ سکی

روایتی غزل میں عاشق وفا کرتا ہے اور محبوب جفا لیکن کیا ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے؟ زندگی اکثر اس قسم کے المیوں سے دوچار کرتی ہے کہ محبوب جفا نہیں کرتا یا کرنا نہیں چاہتا اور عاشق وفا کرنا چاہتا ہے مگر زندگی کی مجبوریاں وفا کرنے نہیں دیتیں۔ یہ بھی غیر روایتی مضمون ہے مگر انداز بیان دھوکا دے جاتا ہے کہ شاید روایتی بات کہی ہے۔

انجم صاحب کے کلام میں شروع سے آخر تک پختگی، قادر الکلامی اور فنی مہارت پائی جاتی ہے۔ وہ مشکل زمین میں غزل کہیں یا آسان زمین میں۔ لمبی بحر اختیار کریں یا چھوٹی بحر۔ سارے کلام سے یہ احساس ہوتا ہے کہ انتہائی سہولت سے انجام پایا ہے لیکن غور سے دیکھئے تو مشکل معلوم ہے اور درحقیقت سہل ممتنع کی یہی تعریف ہے۔ چند اشعار بلا تبصرہ ملاحظہ ہوں:-

طے کیجے غم کی منزلیں جیسے بھی بن پڑے
شاید کہیں تو وادیٔ سرو و سمن پڑے

یہ قربتیں کہ خود پہ تمہارا گمان ہو
یہ فاصلے کہ تم کو پکارے نہ بن پڑے

اِک اِک چراغ دل کے دریچوں میں بجھ گیا
تاریکیوں میں ڈوب گیا روشنی کا شہر

صحرا کی دھوپ، شہر کی چھاؤں سب ایک ہیں
انجم کبھی ہوا ہے کسی اجنبی کا شہر

کوئی دیوانگیٔ اہلِ جنوں تو دیکھے
پا شکستہ ہیں مگر عزمِ سفر باقی ہے

اُف یہ زنجیرِ گرانبار کہ کاٹے نہ کٹے
ہائے یہ رات کہ تا حدِ نظر باقی ہے

مری وفا بھی فسانہ تری جفا بھی فسوں
یہاں ہر ایک کی مجبوریاں ہیں گوناگوں
نہ کوئی پاؤں کی آہٹ نہ شعلۂ آواز
یہ سنسناتی ہوئی رات کس طرح کاٹوں
تُو وہ گھٹا کہ برستی ہے کھُل کے دریا پر
میں ایک دشت کہ اپنی تپش میں آپ جلوں

اس طرح کے بہت سے لطیف اشعار ان کے اس مختصر مجموعے میں موجود ہیں۔ اگر انجم صاحب مسلسل لکھتے رہتے اور دنیائے شاعری سے اپنے آپ کو منقطع نہ رکھتے تو دورِ حاضر کے چند اہم غزل گو شاعروں میں ان کا نام شامل ہوتا۔ کاش یہ مختصر مجموعہ انجم صاحب کو اپنے کلام کی تدوین پر مائل کر سکے۔

ڈاکٹر خواجہ محمدؐ زکریا

انجم صاحب

وہ اپنی ذات سے اک انجمن ہے

برِّصغیر کے جو شہر علم و ادب کا مرکز رہے ، ان میں ایک نام بدایوں کا بھی ہے ۔ انجم صاحب کا وطن مالوف یہی شہر ہے ۔ آپ کی ولادت ۱۹۱۹ء میں ہوئی ۔ والدین نے تقی الدین نام رکھا ننھیال آل احمد کے نام سے پکارتے تھے ۔ آپ کے والد مجید الدین محکمہ پولیس میں انسپکٹر تھے ، اور ۱۹۳۸ء میں وفات پائی ۔

تقی الدین کی ابتدائی تعلیم بجنور میں ہوئی ۔ میٹرک کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا ۔ چنانچہ مختلف یونیورسٹیوں کی طرف سے دعوت نامے موصول ہوئے ۔ آپ نے علیگڑھ کا انتخاب کیا ۔ ایم ۔ اے تک وہیں تعلیم حاصل کی ۔

شعری ذوق ورثہ میں ملا تھا ۔ دادا رضی اچھے شاعر تھے ۔ والد بھی سخن فہم تھے اور شعر کہتے تھے ۔ والد کے چچا نظام الدین حسن نظامی پریس بدایوں کے مالک تھے جنہوں نے سب سے پہلے دیوانِ غالب بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا ۔ اس ادبی ماحول میں پرورش ہوئی ۔ تیسری جماعت میں پڑھتے تھے کہ سکول کی بزم ادب (سبھا) میں حصّہ لینے لگے ۔ آپ کی تربیت میں میاں عطاء اللہ خاں اور مولوی غلام قاسم جیسے قابل اساتذہ کا بڑا حصّہ ہے ۔ سبھا میں ہندو مسلم طلبا شعری تخلیقات پیش کرتے تھے ۔ ایک روز مولوی غلام قاسم نے مصرع طرح دیا ۔

ع   ہمارے درد کی کس کو خبر ہے !

اس پر یوں گرہ لگائی ؎

جہاں کے لوگ انجم چین سے ہیں
ہمارے درد کی کس کو خبر ہے

انجم صاحب کو بڑے اچھے ساتھی ملے جن کی صحبت نے مذاق کو نکھارنے میں بڑی مدد کی۔ شکیل بدایونی پہلی سے بی۔ اے تک ہم جماعت رہے۔ راز مراد آبادی روم فیلو تھے۔ علی گڑھ کے زمانے میں آپ کے دوستوں میں جاں نثار اختر، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی (انجم صاحب کے قریبی عزیز) ڈاکٹر صفدر حسین، علی سردار جعفری، معین احسن جذبی، شان الحق حقی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ اساتذہ میں آپ رشید احمد صدیقی۔ آل احمد سرور، ڈاکٹر ضیاء الدین، ڈاکٹر امیر حسن صدیقی سے خاص طور پر متاثر ہوئے۔

شعر گوئی کی ابتدا بچپن ہی سے ہو چکی تھی۔ سکول کے زمانے میں باقاعدہ شعر کہنے لگے اور بدایوں کی ادبی محفلوں میں شریک ہونے لگے۔ ان دنوں بدایوں میں شعر و سخن کا خوب چرچا تھا۔ تقریباً ہر رات مختلف مقامات پر شعری نشستیں منعقد ہوتیں۔ اس وقت دو ادبی گروپ تھے۔ ایک کی نمائندگی قمر بدایونی کرتے تھے اور دوسرے کی ذوق بدایونی، انجم صاحب نے باقاعدہ کسی سے اصلاح نہیں لی البتہ کبھی کبھی قمر بدایونی سے مشورہ کر لیتے تھے۔ اس زمانے کے اشعار کی بیاض ہندوستان میں ضائع ہو گئی۔

انجم صاحب نہایت زیرک طالب علم تھے۔ مشاعروں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے اور شعراء پر برجستہ جملے کستے۔ پیروڈی لکھنے میں کمال حاصل کر لیا۔ ایک روز بدایوں میں مشاعرہ تھا جس میں دل شاہجہانپوری، آل رضا، سیماب اکبر آبادی وغیرہ شریک ہوئے۔ آل رضا نے یہ شعر پڑھا۔ ؎

اک شمع ہے من جملہ اسبابِ شبِ غم
اے مصلحتِ وقت جلائیں کہ بجھائیں

آپ نے یوں مصرع اٹھایا۔

ع اک شمع ہے من جملہ اسبابِ شبِ وصل

دل شاہجہانپوری نے جب یہ شعر پڑھا

دو چار نظر آتے جہاں موئے سفید — پیری نے وہیں نبضِ جوانی دیکھی

آپ نے ذرا اونچی آواز میں دوسرا مصرع یوں پڑھ دیا۔

ع بیوی نے وہیں نبضِ جوانی دیکھی

اور دل شاہجہانپوری غزل نہ سنا سکے۔ اس پر قمر بدایونی نے سرزنش کی لیکن انجم صاحب کی یہ عادت نہ گئی۔ اب بھی بعض اوقات فی البدیہہ پیروڈی کر دیتے ہیں۔

انجم صاحب کا کلام "گلدستہ" بدایوں اور علی گڑھ میگزین میں چھپتا رہا۔ آپ نے سپیشل آرٹ کرافٹس اور میوزک میں بھی ڈپلوما حاصل کیا۔ کچھ دنوں شانتی نکیتن یونیورسٹی سے وابستہ رہے۔ شادی ۱۹۴۰ء میں ہوئی۔ سسرال میں بڑے عالم فاضل بزرگ تھے۔ بیوی کے دادا مولوی محمد حسین مشن سکول میں ٹیچر تھے۔ انہوں نے انگریزوں سے انگریزی پڑھی اور انہیں عربی سکھائی قرآن پاک کا انگریزی میں ترجمہ کیا جو جرمنی میں شائع ہوا۔ جب شادی کے بارے میں مَیں نے سوال کیا تو آپ کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی اور کہنے لگے۔ جب بارات جا رہی تھی تو مَیں نے یہ شعر موزوں کیے۔

ے آج انجم تمہیں اس بزم میں جانا ہوگا — رسم و آدابِ زمانہ کو نبھانا ہوگا
ساز دل ٹوٹ چکا ہے یہ سمجھتا ہوں مَیں — پھر بھی اس ساز پہ اب گیت تو گانا ہوگا
اشکِ غم اشکِ تبسم میں چھپانا ہوں گے — شعلۂ درد کو کافور بنانا ہوگا

آپ کی بیگم نکہت نسیم بھی شعر کہہ لیتی ہیں۔ کئی نظمیں ہندوستان کے موقر جرائد میں شائع ہوتی رہیں۔ دو شعر سنئے

ے یہ حسرت مجھ کو وہ تسکین دیتے — مَیں بد قسمت انہیں سمجھا رہی ہوں
جگر میں آگ ہونٹوں پر تبسم — مَیں کچھ خود دار بنتی جا رہی ہوں

یہ شعر غالباً ۱۹۴۱ء کے ہیں اور اب تک دونوں رسم و آدابِ زمانہ کو نبھا رہے ہیں۔

ایم۔ اے کرنے کے بعد انجم صاحب کچھ دنوں "آہنگ" میں کام کرتے رہے۔ پھر ۱۹۴۸ء میں لاہور آ گئے۔ مئی ۱۹۴۹ء میں گورنمنٹ کالج جھنگ میں لیکچرار اردو تعینات ہوئے

اس وقت میں سال دوم کا طالب علم تھا۔ انجم صاحب کی آمد پر یہاں اردو کی کلاس شروع ہوئی سو کھے لمبے بال، داڑھی مونچھ صاف، دبلے پتلے ڈبل بریسٹ سوٹ میں ملبوس انجم صاحب جھوم جھوم کے چلتے دکھائی دیتے۔ کالج کی تقریبات میں رونق محفل بھی ہوتے اور شریکِ شورشِ محفل بھی ہوتے ان کے آنے سے کالج کی علمی و ادبی سرگرمیوں میں جان پڑ گئی۔ مشاعرے ہونے لگے صاحبزادہ رفعت سلطان اور افضل حسین اظہر طلبا میں سے شاعر کی حیثیت سے ابھرے۔ شہر میں شعری محفلیں برپا ہونے لگیں۔ آغا نو بہار علی خاں مرحوم۔ ساحر صدیقی۔ مجید امجد مرحوم۔ شیر افضل جعفری۔ غلام محمد رنگیں۔ مظفر علی ظفر وغیرہ سب دوست مل بیٹھتے اور انجم صاحب کے دوست شعری صاحب ان محفلوں کے اہتمام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔

ع کسے اب یاد ہے اک خواب دیکھا تھا جوانی میں

میں اردو کا طالب علم نہیں تھا اس لیے براہِ راست انجم صاحب سے مستفیض ہونے کا موقع نہیں ملا۔ میں اپنے اساتذہ میں سے ملک محمد یار (جغرافیہ) اور ڈاکٹر محمد عبد اللطیف (فارسی) سے خاص طور پر متاثر تھا۔ ملک صاحب اپنی سادگی اور صاف گوئی کی وجہ سے اور لطیف صاحب اپنے علمی ذوق اور "برق رفتاری" کے باعث ہر دلعزیز تھے۔ دونوں انجم صاحب کے گہرے دوست تھے اس لیے مجھے بھی انجم صاحب کی باتیں سننے کے مواقع میسر آجاتے۔ ہمارے ایک ہم جماعت نے اردو رکھی۔ انجم صاحب اس کے ذوق سے بڑے متاثر ہوئے اور کہا کوئی شعر سنایئے۔ اس نے یہ شعر غالب سے منسوب کرتے ہوئے کہا

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی "ہور" نہیں ہوتا

اور انجم صاحب لطیف صاحب سے پوچھنے لگے یہ "ہور" کیا ہوتا ہے اور جب انہیں پتا چلا کہ لڑکے نے دوسرا کا پنجابی ترجمہ کیا ہے تو پھر کبھی کلاس نہ لی۔ اس سے کہہ دیا تھا کہ خود پڑھ لیا کرو جب کوئی مشکل پیش آئے تو لطیف صاحب سے پوچھ لینا۔ کہنے کا مقصد یہ تھا کہ انجم صاحب بد ذوقی کو کسی

حال میں برداشت نہیں کرتے ۔ محلے کی مسجد کے مولوی صاحب سے اس لیے نہیں بنتی کہ وہ بے وزن شعر لاؤڈ سپیکر پر پڑھتا ہے ۔

انجم صاحب کو مَیں نے ایک شفیق استاد، ایک مخلص رفیق کار، ایک ہمدرد دوست اور مہربان افسر کے روپ میں دیکھا ہے ، جب لیکچرار تھے اس وقت بھی نادار طلباء کی امداد کرتے یا مخیر حضرات سے اپیل کر کے استعانت کرتے ۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ بعض اوقات طلباء کو غزلیں لکھ کر دے دیتے تاکہ وہ رسالوں میں چھپوا کر معاوضہ حاصل کریں ۔ یہ جذبہ آج بھی اسی طرح ہے ۔ غریب طلباء اور ملازمین کی حتی الوسع مدد کرتے ہیں اور اس سلسلے میں خطرہ مول لینے سے بھی نہیں گھبراتے ان کا خیال ہے کہ اگر کام نیک نیتی سے کیا جائے تو کبھی نقصان نہیں ہوتا اور ان کا یہ فارمولا ابھی تک غلط ثابت نہیں ہوا ۔

انجم صاحب بڑے خلیق اور ملنسار ہیں اور حق بات کے لیے ہر طرح مدد کرنے کے لیے تیار ہیں ۔ ایک دن میرے ایک دوست تشریف لائے ۔ انجم صاحب کی خادمہ سے جھگڑا ہوا تھا بہت غصے میں تھے کہ انجم صاحب نے اپنی خادمہ کی خاطر ہم پر بڑی زیادتی کی ہے ۔ مَیں نے کہا اگر آپ کا قصور نہیں تو انجم صاحب سے مل لیں لیکن وہ ملنے سے کترا رہے تھے ۔ بہرحال وہ میرے کہنے پر چلے گئے اور تھوڑی دیر بعد واپس آ کر کہنے لگے ۔ ہمیں تو معلوم نہ تھا انجم صاحب تو فرشتہ سیرت انسان ہیں ۔ خادمہ کو خوب ڈانٹا ہے کیونکہ قصور اس کا تھا ۔

انجم صاحب بلا کے ذہین آدمی ہیں ۔ حافظہ کمال کا ہے ۔ کسی موضوع پر بے تکان گفتگو کر سکتے ہیں شگفتگی اور خوش مزاجی ہر بات میں نمایاں ہے ۔ چھیڑ چھاڑ اور دل لگی میں خوب لطف لیتے ہیں بلکہ ”کھانا بے دل لگی سے نہیں پچتا“ جہاں بھی رہے ایسی اکٹویٹی سے جی بہلاتے رہے ۔ تحریر و تقریر میں بلا کا زور ہے اور سحر بیانی سے پتھر پانی ہو جائیں ۔ یاد نہیں کسی کے بارے میں پڑھا تھا کہ کہتا تھا ۔ مجھے پانچ منٹ گفتگو کرنے کے لیے دے دیئے جائیں حالات خود بخود ٹھیک ہو جائیں گے ۔ میرا خیال ہے انجم صاحب کو اس سے کم وقت کی ضرورت ہے ۔ جھنگ کے علاوہ پیر محل ۔ گوجرہ ۔ لائلپور

اور میانوالی میں بھی کام کیا اور ہر جگہ خوشگوار یادیں چھوڑیں ۔ الجھے ہوئے مسائل کو ایسا "گل حکمت" (ان کی ایک خاص اصطلاح) کرتے ہیں کہ ان کی موقع شناسی کی داد دینا پڑتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ طلبا "بابا" کہتے ہیں اساتذہ اپنا بزرگ سمجھتے ہیں اور ملازمین اپنا ہمدرد ۔ دل کے صاف ہیں کسی پر زیادتی کر بیٹھیں یا کوئی زیادتی کرے —— معافی مانگ لیں گے یا بہت جلد بھول جائیں گے عموماً درگزر سے کام لیتے ہیں ۔ اپنا مفاد تو ہر شخص کو عزیز ہوتا ہے لیکن دوسروں کے مفاد کا خیال رکھنا بڑی بات ہے ۔ اس دور میں ایسے انسان بہت کم ملتے ہیں ۔

ع   باتیں "تمہاری" یاد رہیں   پھر باتیں نہ ایسی سنئے گا

انجم صاحب نے روایت کی فضا میں آنکھ کھولی ۔ شاعری کی ابتدا ، رومانی نظموں سے کی ۔ غزل کا یہ شعر اسی دور کی یادگار ہے ۔

اپنے بازو میری گردن میں حمائل کر دو
آج تقدیر کو تدبیر کا قائل کر دو

پابند نظموں اور روایتی غزلوں کے علاوہ آزاد نظمیں بھی لکھیں ۔ پہلی آزاد نظم ۱۹۴۱ء میں کہی جو بغیر عنوان کے تھی ۔ جو نظمیں دستیاب ہو سکیں شاملِ مجموعہ ہیں ۔ دیگر اہم نظموں میں پس پردہ ۔ خودکشی اعتراف ۔ دوزخی ۔ طوائف ۔ جنگِ آزادی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں لیکن افسوس ہے کہ یہ نظمیں کہیں سے مل نہ سکیں اور اب قویٰ مضمحل ہونے کی وجہ سے اُن کے ذہن سے بھی اتر گئی ہیں ۔ "پس پردہ" کے ابتدائی تین مصرعے کچھ یوں ہیں ۔ (معلوم ہوا کہ یہ نظم نقوش کے کسی شمارے میں چھپ چکی ہے)

کتنی خاموش نگاہوں نے بہائے آنسو
کس قدر پھول سے ہونٹوں نے پیے زہر کے جام
کتنے ہونٹوں پہ ملمع ہے تبسم کا ابھی

"دوزخی" کا ایک بند ردی کاغذوں میں ملا ۔

مجھ سے فرمائش اشعار نہ ہوگی اب تو

میری وحشت کے تماشے تو نہ دیکھے گا کوئی

آج اس سازِ شکستہ کو نہ چھیڑے گا کوئی

سرد راتوں میں بھی جلتی رہی یہ جانِ حزیں

پار اترنے پہ بھی دریا کے کنارے نہ ملے

اب میں ان آگ کے شعلوں میں سکوں پاؤں گا

اس کی آغوش میں بھی جب مجھے جنت نہ ملی

متذکرہ نظموں میں سے کئی ایک ہندوستان کے منتخب ادب میں شائع ہوئیں۔ انجم صاحب کی نظمیں جدید دور کی نظموں کا ساتھ دیتی ہیں ان میں اشاریت اور سمبل ہیں لیکن اتنے پیچیدہ نہیں کہ قاری شاعر کے ذہن تک نہ پہنچ سکے۔ مثال کے طور پر "مادرِ مہرباں" موت کا سمبل ہے اور رگِ سنگ —— اس کا جو "سب جھوٹ" لکھ دیتا ہے۔ "ایک تصویر" شاعر کے ہمزاد کی تصویر ہے۔ نظم "دستک" کا تجزیہ ڈاکٹر وزیر آغا نے بڑے خوبصورت الفاظ میں کیا ہے۔

ولی۔ میر۔ درد۔ مومن۔ غالب۔ نظیر۔ انیس۔ اقبال اور کلاسیکل کتابوں کے مطالعہ کے مطالعہ نے انجم صاحب کی زبان میں نکھار پیدا کر دیا ہے کلام میں استادانہ پختگی ہے اور تخیل میں بلند پردازی، سیدھی (STRAIGHT) بات کہتے ہیں لیکن زبان پر بے پناہ قدرت ہے اس لیے سادگی میں بھی پُرکاری نظر آتی ہے۔ سیدھا سادا خیال شعری سانچوں میں ڈھل کر دو آتشہ بن جاتا ہے۔

ابتدا میں واقعاتی اور عشقیہ شاعری کی روایت پر چلتے رہے لیکن جلد ہی اس خول سے باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگے چنانچہ پرانے انداز کی شاعری سے سمجھوتہ نہ ہو سکا۔

عمر بھر کون کسے یاد کیا کرتا ہے

وقت کے ساتھ خیالات بدل جاتے ہیں

بعد کی غزلوں میں روایت کی پاسداری بھی ہے نئے تجربے اور نیا طرزِ احساس بھی اس دور کے کرب کو پرانے سانچوں میں نئے رنگ میں پیش کرتے ہیں گویا تازہ غزلیں روایت کے

ورثہ کی امیں ہونے کے ساتھ ساتھ نئی غزل کے تقاضوں کو بھی پورا کرتی ہیں۔ اس شکست و ریخت کے دور میں بھی انہوں نے غزل کی حُرمت کو قائم رکھا ہے۔ غرض انجم صاحب کی غزل روایت کے سانچوں میں ابھرنے والی تہذیب یافتہ غزل کی ڈکشن ہے۔

غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

یہ احترامِ تمنا یہ احتیاطِ جنوں
کہ تیری بات کروں اور تیرا نام نہ لوں

گھوم پھر کر ترے قدموں میں چلے آئینگے
اک ذرا مرحلۂ شمس و قمر باقی ہے

گھٹتا جاتا ہے خطِ پیمانہ
بڑھتی جاتی ہے تشنگی ساقی

دُور سے دیکھو تو کتنے جانے پہچانے ہیں لوگ
پاس سے دیکھا تو سارا شہر بیگانہ مِلا

ہم تو اس وادیٔ بے نُور سے یونہی گزرے
چاند سُورج لیے اب شام و سحر آئے ہیں

یہ برف کے ستون یہ پتھر کی مُورتیں
آئینہ بن گیا ہے تری بے رُخی کا شہر

دیوارِ غم پہ تیشۂ غم ٹوٹتے رہے
ہم حسرتوں کا تاج محل بن کے جی لیے

زمیں کھینچ ہی لیتی ہے سب کو اپنی طرف
ہوائے جوشِ مسرت میں آسماں نہ بنو

محمد حیات خاں سیال

پروفیسر تقی انجم علیگ کے کلام کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا اُردو شاعری کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ غزل کی روایت بلکہ اس کی رُوح ان کی غزلوں میں اپنے آپ کو پوری طرح رونما کرتی ہے۔ کسی روایت سے اس طرح کا تعلق بذاتِ خود اس بات کی دلیل ہے کہ جو شاعری تخلیق کی جا رہی ہے وہ یقیناً جاندار ہو گی۔ خصوصاً ان حالات میں کہ جب شاعر اپنے آس پاس اور گرد و پیش سے بیگانہ نہ ہو۔ انجم صاحب اپنے ماحول کا گہرا شعور رکھتے ہیں اور اسی احساس اور شعور کی وجہ سے وہ متنوع موضوعات کو اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں۔ ان کے ہاں نئے احساس کا پتہ چلتا ہے اور اس احساس کے اظہار میں روایت کے ساتھ تجربے کی آمیزش ایک ایسے انداز کو جنم دیتی ہے جو دلوں میں جگہ بناتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہی ان کے کلام کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

ان کے موضوعات متنوّع ہیں۔ ان کی نظر میں وسعت ہے۔ وہ انسانی زندگی کی پیچیدگیوں کا شعور رکھتے ہیں، جذباتی معاملات، معاشی معاشرتی اور تہذیبی حالات کی الجھنوں کو بھی پوری طرح سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو احساس اور جذبہ ان کی شاعری میں نظر آتا ہے وہ جدید دور کے انسان کا احساس اور جذبہ ہے۔ اس کا اظہار وہ روایت کی پاسداری کے ساتھ کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کے ہاں روایت اور تجربے کا یہ حسین امتزاج سب سے زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی